مقالات

یوم رضا قدس سرہ العزیز

ترتیب و تقدیم

قاضی عبدالنبی کوکب — حکیم محمد موسیٰ امرتسری

دائرۃ المصنفین ○ لاہور

مقالاتِ یومِ رضا

ان مقالات کا مجموعہ، جو اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا قادری قدس سرہٗ کے اڑتالیسویں عرس کے موقع پر منعقد ہونے والے "یوم رضا" (۲۲ جون ۱۹۶۸ء زیر اہتمام مجلس صداقت اسلام لاہور) کے سلسلے میں، لکھے گئے،

تقدیم و ترتیب

قاضی عبد النبی کوکب

ناشرین

دائرۃ المصنفین، اردو بازار - لاہور

کتاب :	مقالاتِ یومِ رضا
مرتب :	قاضی عبدالنبی کوکب
ناشرین :	دائرۃ المصنفین اُردو بازار۔ لاہور
طبع اول :	جون۔ ۱۹۶۸ء۔ صفر ۱۳۸۸ھ ہجری
تعداد :	ایک ہزار
صفحات :	۱۴۴
کتابت :	سید سعید
سرورق :	حافظ یوسف سدیدی
طباعت :	لاہور آرٹ پریس، لاہور
قیمت :	دو روپے پچھتر پیسے ۲/۷۵ روپے

مندرجات

تقدیم پر نظرِ ثانی

(۲۷-محرم ۱۳۸۹ھ / ۱۴راپریل ۱۹۶۹ء)

۱۲رجون ۱۹۶۸ء کو لاہور میں منعقد ہونے والے "یوم رضا" کو اہلسنت نے اپنے سفر کا اہم موڑ قرار دیا، مگران منجمد حلقوں نے، جو ہمارے ہاں تعمیر و احیاء کے ہر کام کی مخالفت کیا کرتے ہیں، اس تحریک کی مخالفت کو بھی ضروری سمجھا۔ چنانچہ "مقالاتِ یوم رضا" کی تقدیم کو موزوں نشانہ قرار دیا گیا، اور تیر و کمان سنبھال لئے گئے۔ مخالفت کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد تو موجود نہ تھی، اس لئے "اعتراض برائے اعتراض" کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ بعض جملوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر غلط معانی پہنائے گئے، اور مؤلف کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک مہم چلا دی گئی۔ ع أُرِيدُ حياته ويريدُ قتلي

اگرچہ مہم کا انداز مجادلانہ تھا، تاہم میں، بتوفیقہ تعالیٰ "اعتراضات" پر حقیقت پسندانہ غور کرتا رہا اور اپنے مخلص علماء سے مشورہ بھی لیتا رہا۔ بالآخر طے یہ پایا کہ گو "معترضین کوئی اصولی بات سامنے نہیں لا سکے۔ پھر بھی اولیٰ یہی ہے کہ زیرِ اعتراض جملوں میں چند وضاحتی الفاظ بڑھا دیئے جائیں۔ تاکہ اپنی طرف سے اتمام حجت میں کوتاہی نہ رہے۔ چنانچہ مذکورہ اضافات اور ایک دو مقامات پر موزوں تر متبادلات کیساتھ، اس تقدیم کو دوبارہ لکھوا کر پیش کیا جا رہا ہے"۔

میں یہ کام، محض جذبۂ اصلاح کے تحت کر رہا ہوں، اور امید رکھتا ہوں کہ مخلصین اہل سنت میرے اس اقدام پر اطمینان و مسرت محسوس کرینگے۔ البتہ ان حلقوں میں شاید مایوسی پھیلے، جو بے اساس مخالفت کیساتھ، میرے ہٹ دھرم ہونے کا اعلان بھی کرتے رہے ہیں۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ٥

کوکب۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

(مع اضافہ و ترمیم)

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے، راہ کو پُر خار دیکھ کر

مولانا احمد رضا رحمہ اللہ کا یوم منانے، اور ان کی شخصیت سے متعلق، یہ مختصر یادگاری کتاب پیش کرنے کا مقصد، یہ ہرگز نہیں کہ دیوبندی بریلوی اختلافات کی تلخیاں، از سرِ نو تازہ کی جائیں۔ ہم ایک صاحب عقیدہ ملت ہیں اور ہمارے ہاں علمی اور اعتقادی اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں۔ بعد میں آنے والے لوگ اگر ان اختلافات کی اصل اہمیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی غلط رنگ میں تفریق و تشتت کی خلیجیں وسیع کرنے لگیں تو اسے یقیناً تخریبی اور منفی طرزِ عمل قرار دیا جائے گا۔

مذکورہ ذہنیت اور طرزِ عمل کے بالکل برعکس، اس کتاب میں، مولانا احمد رضا کی شخصیت اور ان کی دینی، علمی اور تہذیبی خدمات پر،

مثبت انداز میں ایک نظر (گو سرِدست طائرانہ ہی سہی) ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ تاہم، مولانا کی شخصیت کے ساتھ وابستہ بعض اختلافی مباحث کا حقیقت پسندانہ مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ تاکہ کم علمی اور معاندانہ رویے سے پیدا ہونے والی تلخیاں، اور غلط فہمیاں دُور کرنے کی سعی کامیاب ہو سکے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا احمد رضا ہمارے برِعظیم کی ان ممتاز شخصیتوں میں ہیں۔ جن کے علم وفضل اور جن کی جدوجہد سے، مسلمانانِ ہند کے دینی وتہذیبی شعور کو بیدار اور مستحکم کرنے میں مدد ملی۔ مگر ہماری تاریخ نگاری کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مولانا موصوف کے بارے میں' قطعاً کوئی ٹھوس معلومات جمع نہیں کی گئیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ چند ایک انتہا پسندانہ معتقدات' ان کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں' اور بعض علمائے دیوبند کے ساتھ ان کے اختلافات کو، ایک خاص رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں، مولانا کے بارے میں تنگ نظری اور انحراف پسندی کے افسانے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی عام ہو گئے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

جماعت اسلامی کے ایک رکن، جناب محمد رفیق اشرفی[1] اپنی ایک تحریر

---

[1] اشرفی صاحب' سالہا سال تک' سید ابوالبرکات مدظلہ' کے حلقۂ درس سے وابستہ رہے ہیں اس دور میں انہیں' مولانا احمد رضا قدس سرہٗ اور انکے رفقاء کی اکثر تالیفات کے مطالعے کا موقع ملا۔ جماعت اسلامی میں آ کر' انہوں نے دیوبند مکتب فکر' اور بعض دیگر مکاتب فکر کا لٹریچر بھی پڑھا۔ چنانچہ فریقین کے افکار، بالخصوص اختلافی مباحث کی حقیقت سے انہیں آگاہی حاصل ہے۔ اشرفی صاحب' مولانا احمد رضا کے تبحرِ علمی' صداقتِ ایمانی اور تعلق بالرسول سے گہرے متاثر ہیں۔

میں، مذکورہ بالا کیفیت کی ایک مثال بیان کرتے ہیں:

"——— چند ماہ پیشتر کی بات ہے، مرکز جماعت اسلامی میں، مولانا مودودی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر تھا۔ اور بھی کچھ لوگ بیٹھے استفادہ کر رہے تھے۔ کہ ایک صاحب نے سوال کیا: "مولانا! بعض علماء جن میں بریلوی حضرات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب کُلّی (اللہ تعالیٰ کے برابر) کے قائل ہیں۔ کیا یہ شرک یا کفر نہیں؟" جواباً مولانا نے فرمایا:۔ اگرچہ یہ عقیدہ رکھنا نہایت خطرناک بات ہے۔ تاہم ان حضرات کو کافر یا مشرک کہنے سے گریز ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے لئے علم ذاتی اور نبی اکرم کے لئے علم عطائی کے قائل ہیں ——— یعنی اللہ کا عطا کردہ ——— اس فرق کی بنا پر بہر حال، ایسے الفاظ کے اطلاق سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اس موقع پر میں (رفیق اشرفی) نے عرض کیا "مولانا مگر میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اور مولانا نعیم الدین مراد آبادی (رحمۃ اللہ علیہ) نے خالص الاعتقاد اور "الکلمۃ العلیا" میں صاف لکھا ہے ——— "کہ اگر کوئی شخص، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علم کو، مقدار میں، اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ وہ نسبت بھی دیتا ہے، جو ایک ذرّے کو آفتاب سے، یا ایک قطرے کو سات سمندروں سے ہے۔ تب بھی وہ کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا علم محدود ماننا لازم ٹھہرتا ہے"۔

"اس پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:" اچھا (نباکر کے) ——— اگر یہ درست ہے، تو معلوم ہوتا ہے، غلط فہمیاں زیادہ ہیں، اور اختلافات کی حقیقت، بہت کم ——— "

مناسب ہوگا۔ کہ یہاں، مذکورہ بالا مبحث سے متعلق، خود مولانا احمد رضا قدس سرہٗ کی تالیف خالص الاعتقاد سے چند اقتباسات درج کئے جائیں:

"...... مسئلہ علم غیب میں افترا چھانٹنے شروع کئے۔ کبھی یہ کہ وہ (یعنی احمد رضا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم، ذاتی بے عطائے الٰہی مانتا ہے۔ کبھی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم، علم الٰہی سے مساوی جانتا ہے۔ صرف قدم و حدوث کا فرق کرتا ہے۔ کبھی یہ کہ باستثنائے ذات و صفات الٰہی، باقی تمام معلوماتِ الٰہیہ کو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم، محیط بتاتا ہے .... حالانکہ، اللہ واحد قہار دیکھ رہا ہے کہ یہ سب ان .... کا افترا ہے۔ سچے ہیں، تو بتائیں، کہ ان میں سے کون سا جملہ، فقیر کے کس رسالے، کس فتویٰ، کس تحریر میں ہے ..."

(خالص الاعتقاد ص ۲۳)

ذرا آگے چل کر، اپنا موقف یوں بیان کیا ہے:

"..... علم ذاتی، اللہ عزّ و جلّ سے خاص ہے۔ اس کے غیر کے لئے محال ہے۔ جو اس میں سے کوئی چیز، اگرچہ ایک ذرّے سے کمتر سے کمتر، غیر خدا کے لئے مانے۔ وہ یقیناً کافر و مشرک ہے ....."

...... تمام اہلِ عالم، اگلے پچھلوں، سب کے جملہ علوم جمع کئے جائیں، تو ان کو علوم الٰہیہ سے وہ نسبت نہ ہوگی۔ جو ایک بوند کے دس لاکھ حصوں سے ایک حصّے کو، دس لاکھ سمندروں سے ....." (خالص الاعتقاد ص ۲۵)

.....ہم نہ علمِ الٰہی سے مساوات مانیں، نہ غیر کے لئے علم بالذات جانیں، اور عطائے الٰہی سے بھی، بعض علم ہی ملنا مانتے ہیں۔ نہ کہ جمیع.....''

(خالص الاعتقاد - ص ۲۵)

تقریباً اس سے ملتی جلتی کیفیت، مسئلہ تکفیر کی بھی ہے۔ مولانا احمد رضا کے بارے میں، عام تاثر یہی پھیلا ہوا ہے۔ کہ وہ بہت بڑے کافر گر تھے ان کے فتوائے کفر کے تیروں سے، نہ صرف علمائے دیوبند، بلکہ بہت سے دیگر صالحین اور بعض علمائے سلف تک محفوظ نہیں رہے۔ اس انداز کی باتیں، خود مولانا کی زندگی میں ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ ۱۳۲۴ھ میں "حسام الحرمین" شائع ہوئی تھی۔ اور اس میں مذکورہ صورت حال کا منظر یوں بیان کیا ہے:

"........عوام مسلمین کو بھڑکانے اور دن دہاڑے' ان پر اندھیری ڈالنے کو، یہ چال چلتے ہیں کہ علمائے اہلسنت کے فتوائے تکفیر کا کیا اعتبار۔ یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر کافر کہہ دیتے ہیں۔ ان کی مشین میں ہمیشہ کفر ہی کے فتوے چھپا کرتے ہیں۔ اسمٰعیل دہلوی کو کافر کہہ دیا۔ مولوی اسحاق صاحب کو کہدیا۔ مولوی عبدالحی صاحب کو کہہ دیا۔ پھر جن کی حیا اور بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اتنا اور ملاتے ہیں۔ کہ معاذ اللہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو کہہ دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کو کہہ دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب کو کہہ دیا مولانا شاہ فضل الرحمٰن کو کہدیا..... عیاذاً باللہ، عیاذاً باللہ

حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو کہہ دیا......
غرض ہم پر ایسے ہی افترا و بہتان کہتے ہیں......"
(حسام الحرمین - ص ۴۱، ۴۲)

یہ واقعہ ہے، کہ مولانا احمد رضا نے، علمائے دیوبند میں سے بعض اصحاب کی چند عبارات کو کفریہ عبارات قرار دیا - اور لازماً ان عبارات کے مصنفین کی بھی تکفیر کی - لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا کہ ان عبارات میں کفر کے پہلو کا قطعاً احتمال موجود نہیں تھا - خواہ مخواہ کھینچ تان کر، کفریہ معانی ان عبارات میں ڈالے گئے ہیں اور پھر شوقِ تکفیر پورا کیا گیا ہے جہاں تک مذکورہ عبارات کے معانی محتملہ میں قابل اعتراض معنیٰ کے شامل ہونے کا تعلق ہے - تو اس کا تقریباً اعتراف خود ان علمائے دیوبند کی تالیفات سے محسوس ہوتا ہے - جو مولانا تھانوی کے اتباع و خلفاء میں سے ہیں البتہ ان کا موقف یہ ہے، کہ ان عبارات کے مصنّفین نے، ہرگز قابل اعتراض معانی مراد نہیں [۱] لیئے -

---

[۱] اس کی تفصیل کے لئے حسب ذیل کتب دیکھی جا سکتی ہیں - (۱)، الشہاب الثاقب تالیف مولانا حسین احمد مدنی (۲)، توضیح البیان، تالیف سید مرتضیٰ حسن - (۳)، نصرۃ آسمانی، تالیف عبد الشکور کاکوروی (۴)، معرکۃ القلم، تالیف منظور احمد سنبھلی

اول الذکر کتاب میں مولانا مدنی، مولانا تھانوی کی عبارت (جس پر اعتراض کیا گیا)، کی توجیہہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"حضرت مولانا (تھانوی) عبارت میں، لفظ "ایسا" فرما رہے ہیں - لفظ "اتنا" تو نہیں فرما رہے ہیں - اگر لفظ اتنا ہوتا، تو اس وقت البتہ یہ احتمال ہوتا کہ معاذ اللہ حضور

اس مبحث کی مزید وضاحت کے لئے، میں مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن،
ناظم تعلیمات و شعبۂ تبلیغ دارالعلوم دیوبند کی تالیف، اشدّ العذاب
کا ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔ سید صاحب موصوف، مولانا تھانوی کے
خلیفہ تھے اور کتاب مذکور، مرزائیوں کی تردید میں لکھی گئی تھی۔ اس میں
مولانا احمد رضا کی تکفیر علمائے دیوبند پر اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے:۔
"۔۔۔ مرزائی جب بہت تنگ اور عاجز ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ
آخر علمائے دیوبند جو آج ہندوستان میں، مرکز اسلام و مرکز حنفیہ، و مرکز
قرآن و حدیث و فقہ، علوم عقلیہ و نقلیہ کا سرچشمہ ہیں۔ ان کو بھی تو مولوی
احمد رضا خاں صاحب اور ان کے ہم خیال کافر کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اس کا

(۱؎ بقیہ حاشیہ ص۱) علیہ السلام کے علم کو، اور چیزوں کے علم کے برابر کر دیا۔۔۔۔ لفظ "ایسا" تو کلمہ تشبیہ کا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر کسی کو کسی سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ تو سب چیزوں میں مراد نہیں ہوا کرتی (الشہاب الثاقب ص ۱۱۱) یہاں واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبارت زیر بحث کو اعتراض سے بچانے کا دار و مدار، مولانا مدنی لفظ "ایسا" کے مفہوم تشبیہ پر رکھ رہے ہیں لیکن دوسری طرف خود مولانا تھانوی، اپنی تالیف "بسط البنان" میں اسی زیر بحث عبارت کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ لفظ "ایسا" ہمیشہ تشبیہ کے لئے نہیں آتا۔ بلکہ اہل لسان اپنے محاورات فصیحہ میں بولتے ہیں۔ کہا اللہ تعالیٰ ایسا قادر ہے مثلاً۔ تو کیا یہاں خدا تعالیٰ کے قادر ہونے کو دوسرے کے قادر ہونے سے تشبیہ دینا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں ہے" (حفظ الایمان مع بسط البنان ص ۵) اس سے اس امر کا کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ زیر بحث عبارات کا معاملہ کس قدر نازک ہے اور ان کی توجیہ و تعبیر کا مسئلہ اس سے بھی بڑھ کر نازک اور سخت پیچیدہ ہے۔ اس صورت میں مولانا احمد رضا کی نیت پر شبہ کرنا اور یہ فیصلہ دینا کہ انہوں نے محض کافر بنانے کے شوق میں، علمائے دیوبند کو غلط مسلوب معنی پہنائے تھے، انصاف کا متقاضی ہے ٭

جواب بھی خوب توجہ سے سُن لینا چاہیئے۔ علمائے دیوبند کی تکفیر، اور مرزا صاحب اور مرزائیوں کی تکفیر میں، زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بعض علمائے دیوبند کو، خان بریلوی یہ فرماتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں جانتے۔ چوپائے مجانین کے علم کو آپ کے (صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) علم کے برابر کہتے ہیں۔ شیطان کے علم کو آپ کے (صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) علم سے زائد کہتے ہیں۔ لہذا وہ کافر ہیں۔ تمام علمائے دیوبند فرماتے ہیں کہ خان صاحب کا یہ حکم بالکل صحیح ہے جو ایسا کہے، وہ کافر ہے، مرتد ہے، ملعون ہے۔ لاؤ ہم بھی تمہارے فتوے پر دستخط کرتے ہیں۔ بلکہ ایسے مرتدوں کو جو کافر نہ کہے۔ وہ خود کافر ہے۔ یہ عقائد بے شک کفریہ عقاید ہیں۔ مگر خان صاحب کا یہ فرمانا کہ بعض علمائے دیوبند ایسا اعتقاد رکھتے یا کہتے ہیں، یہ غلط ہے...... اگر خاں صاحب کے نزدیک، بعض علمائے دیوبند، واقعی ایسے ہی تھے۔ جیسا کہ انہوں نے انہیں سمجھا، تو خان صاحب پر، ان علمائے دیوبند کی تکفیر فرض تھی۔ اگر وہ ان کو کافر نہ کہتے، تو وہ خود کافر ہو جاتے۔ جیسے علمائے اسلام نے جب مرزا صاحب کے عقائد کفریہ، معلوم کر لئے اور وہ قطعاً ثابت ہو گئے۔ تو اب علمائے اسلام پر مرزا صاحب اور مرزائیوں کو کافر و مرتد کہنا فرض ہو گیا۔ اگر وہ مرزا صاحب اور مرزائیوں کو کافر نہ کہیں، چاہے وہ لاہوری ہوں یا قدنی (قادیانی)، وغیرہ وغیرہ، تو وہ خود کافر ہو جائیں گے۔ کیونکہ جو کافر کو کافر نہ کہے، وہ خود کافر ہے۔

(اشد العذاب ص ۱۲، ۱۳، ۱۴)

یہاں یہ عرض کیا جائے گا۔ کہ مولانا احمد رضا کے نزدیک بعض علمائے دیوبند۔ واقعی ایسے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے انہیں سمجھا۔ یعنی ان کے

نزدیک، عبارات زیرِ بحث، یقیناً کفریہ عبارات تھیں اور کفریہ بھی ایسی کہ جن میں، وہ کسی تاویل کی گنجائش نہیں پا سکے تھے۔ اس لئے وہ حکم تکفیر پر مجبور تھے۔ اس سلسلے میں "حسام الحرمین" کے الفاظ یہ ہیں :-

"...... ہرگز ان ...... کو کافر نہ کہا۔ جب تک یقینی، قطعی، واضح روشن، جلی طور پر ان کا صریح کفر، آفتاب سے زیادہ نہ ہولیا۔ جس میں اصلاً اصلاً، ہرگز ہرگز کوئی گنجائش کوئی تاویل نہ نکل سکی ـــ" (حسام الحرمین۔ ص ۴۶)

دیوبندی مسلک کے احباب اکثر فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کی تکفیر کے معاملے میں ازحد احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ ایک پہلو بھی، اگر ایمان کا نکلتا ہو، تو اُسے کفر کے بیسیوں پہلوؤں پر ترجیح دے کر مسلمان کو حکم کفر سے بچا لینا چاہیئے۔ ان احباب کا منشا یہ ہوتا ہے کہ مولانا احمد رضا نے علمائے دیوبند کی تکفیر میں عدم احتیاط اور زیادتی سے کام لیا ہے۔ مگر مولانا کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اس مسئلے میں ازحد احتیاط اور ذمہ داری کے قائل تھے۔ آپ کی تالیف "سبحن السبوح" ۱۳۰۹ھ میں طبع ہوئی۔ اس میں مسئلہ امکان کذب باری تعالیٰ میں، بعض علمائے دیوبند کے موقف کو اٹھتر وجوہ سے، کفریہ ثابت کرنے کے باوجود یہی لکھا :-

"ـــ حاش للہ حاش للہ! ہزار بار حاش للہ! میں ہرگز ان کی تکفیر پسند نہیں کرتا۔ ان مقتدیوں یعنی مدعیان جدید کو تو ابھی تک مسلمان ہی جانتا ہوں ...... اور امام الطائفہ اسمٰعیل دہلوی کے کفر پہ بھی حکم نہیں کرتا کہ ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے، اہلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی تکفیر سے منع فرمایا۔ جب تک وجہ کفر آفتاب سے زیادہ روشن نہ ہوجائے

اور حکم اسلام کے لئے اصلاً کوئی ضعیف سا ضعیف محل بھی باقی نہ رہے۔"

(سبحٰن السبوح ص ۸۰، بحوالہ حسام الحرمین ص ۴۵)

چند سطور کے بعد، اسی حسام الحرمین میں، پھر لکھا ہے:

"۔۔۔ یہ بندۂ خدا وہی تو ہے۔ جو خود ان دشنامیوں کی نسبت جب تک ان دشنامیوں پر اطلاع یقینی نہ ہوئی تھی۔ اٹھتر وجہ سے بحکم فقہائے کرام لزومِ کفر کا ثبوت دے کر یہی لکھ چکا تھا کہ ہزار ہزار بار حاش ﷲ! میں ہرگز ان کی تکفیر پسند نہیں کرتا۔ جب کیا ان سے کوئی ملاپ تھا، اب رنجش ہوگئی۔ جب ان سے جائیداد کی کوئی شرکت نہ تھی، اب پیدا ہوئی۔ حاش ﷲ! مسلمانوں کا علاقۂ محبت وعداوت، صرف محبت وعداوتِ خدا و رسول ہے۔ جب تک ان دشنام دہوں سے دشنام صادر نہ ہوئی۔ یا اللہ و رسول کی جناب میں ان کی دشنام (توہین، گالی) نہ دیکھی سنی تھی۔ اس وقت تک کلمہ گوئی کا پاس لازم تھا۔ غایت احتیاط سے کام لیا۔ حتیٰ کہ فقہائے کرام کے حکم سے طرح طرح ان پر کفر لازم تھا۔ مگر احتیاطاً ان کا ساتھ نہ دیا۔ اور متکلمینِ عظام کا مسلک اختیار کیا۔ جب صاف صریح انکار ضروریاتِ دین، و دشنام دہی رب العٰلمین و سید المرسلین صلے اللہ تعالےٰ علیہ وعلیہم اجمعین آنکھ سے دیکھی[1]۔ تو اب بے تکفیر چارہ نہ تھا۔"

(حسام الحرمین۔ ص ۴۶، ۴۷)

---

[1] کتاب کے مصحح نے حاشیہ میں بتایا ہے کہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا فتویٰ، امکان کذب باری کے بارے میں چھپ گیا تھا۔ مگر مولانا احمد رضا نے یہاں تک احتیاط برتی کہ دوسروں کا چھپا ہوا ہے۔ بعد میں اصلی فتویٰ مولانا گنگوہی کے دستخط اور مہر سمیت اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر بھی استظہار کیا کہ دہ بار بار چھپا۔ اور مولانا گنگوہی نے اس کی تردید نہ فرمائی تب جا کر کہیں حکم تکفیر لگایا۔ دیکھئے حاشیہ حسام الحرمین ص ۴۶، ۴۷)

اس گفتگو سے، اگرچہ بظاہر یہی محسوس ہوگا، کہ ایک فریق (مولانا احمد رضا) کے ساتھ جانبدارانہ رعایت برتی جا رہی ہے۔ لیکن در اصل میں، اختلافی تصادم کے اس المیئے کی ایسی تعبیر تلاش کرنا چاہتا ہوں جس کی روشنی میں فریقین ذرا تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ سے، تصویر کے دونوں رُخوں کا مطالعہ کریں اور ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنے کی کوشش کریں۔ بریلوی مکتب کے دوستوں کو اگر یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے، کہ مولانا احمد رضا نے جن عبارات پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا، وہ یقیناً نیک نفسی اور شرعی دیانت سے لگایا تھا۔ اور یہ کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ ان کے نزدیک، عبارات قابلِ تاویل ہرگز نہ تھیں تو انھیں یہ بات بھی مدِنظر رکھنی چاہیئے کہ دوسری طرف دیوبندی مکتبِ فکر کے لوگوں نے بہرحال ان عبارات کو کفریہ نہیں سمجھا۔ یا تو سرے سے قابلِ اعتراض ہی تصور نہیں کیا، اور اگر قابلِ اعتراض سمجھا ہے، تو ان میں ایسی تاویل و توجیہہ کی گنجائش پائی ہے۔ جس کے پیشِ نظر، عبارت کو کفریہ پہلو سے بچایا جا سکتا ہے۔ لہذا ان کے نزدیک، اسی توجیہہ پر عبارت کو محمول کرنا ضروری قرار پایا۔ بہرحال وہ زیرِ بحث عبارات کے مصنفین کو مسلمان قرار دیتے ہیں اور ان کی تکفیر کے فتوے پر اپنے خیال کے مطابق حمیت دینی کی بنا پر اپنی برافروختگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح دیوبندی مسلک کے احباب کو بھی یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ بہرحال ان کے بعض اکابر، علمائے بریلی کے نزدیک کافر قرار پائے۔ ان کے نزدیک، انہوں نے ایسی عبارات لکھیں، جو اللہ اور اس کے رسول کی تنقیص و توہین پر منتج ہوتی ہیں۔ اور پھر ان عبارات پر اصرار کیا گیا۔ اس لئے اپنے خیال کے مطابق، ایسی عبارات اور ان کے قائلین سے بیزاری کے اظہار میں، وہ بھی حمیتِ دینی ہی کا ثبوت دیتے ہیں

آپ نے دیکھا، کس قدر عجیب اور نازک صورتِ حال ہے۔ کہ ہر دو فریق، اپنے اپنے دائرۂ فہم و اعتقاد میں، صراطِ مستقیم پر گامزن اور خدمتِ اسلام میں لگے ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے دشمنِ دین اور خارج از اسلام قرار پاتے ہیں۔

دیوبندی مکتب کی طرف رجحان رکھنے والے بعض حلقوں میں اس تصادم کی ایک توجیہہ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہوئی[1] ہے وہ فرمایا کرتے تھے:۔ "ہند میں میری دو آنکھیں ہیں، ایک مولانا رشید احمد گنگوہی، جو فنا فی اللہ ہیں، اور دوسرے مولانا احمد رضا خاں صاحب جو فنا فی الرسول ہیں۔ اور دونوں حضرات نے ہی دین کی بڑی خدمت کی ہے۔ مگر اپنے خاص مزاج کی وجہ سے، اگر مولانا گنگوہی، کسی کی بات شانِ الٰہی سے فروتر اور ہلکی محسوس کرتے ہیں۔ تو وہ سخت گرفت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی نوبت فتویٰ شرک و بدعت تک جا پہنچتی ہے۔ اسی طرح (مولانا احمد رضا) خان صاحب جب کسی کی تحریر یا گفتگو، مقامِ رسالت کے شایانِ شان نہیں پاتے۔ اور اس میں بظاہر کچھ سقم محسوس ہوتا ہے۔ تو وہ بے قرار و بے قابو ہو جاتے ہیں۔"

مگر یہ توجیہہ زیادہ تر جذبہ و وجدان کی دنیا سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ مذکورہ تصادم میں اصل کار فرما قوت، ایک اصولی، علمی اختلاف ہے

---

[1] اس توجیہہ کے ایک ناقل، پیر عبدالغفور صاحب مہاجر مدنی ہیں۔ ہمیں یہ بات تحریری شکل میں رفیق اشرفی صاحب سے ملی ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں حج کے موقع پر، پیر مدنی صاحب سے ملاقات کی، اور یہ بات سنی۔

تاہم انتہا پسند لوگوں کی اصلاح کے لئے یہ توجیہہ بھی ایک اہمیت رکھتی ہے۔

میں اِس بات کو اپنے قارئین سے چھپانا نہیں چاہتا۔ کہ میں امت کے مختلف مکاتبِ فکر کے مابین حُسنِ معاملت، تحمّل اور میانہ روی کا قائل ہونے کے باوجود، یہ رجحان رکھتا ہوں۔ کہ دیوبندی بریلوی اختلاف کے المیہ میں، مولانا احمد رضا خان کے حصّے میں انتہائی مشکل، انتہائی نازک اور اور انتہائی پُرخطر کام آیا۔ اور انصاف کا تقاضا یہ ہے، کہ ان کی پوزیشن کو پوری توجہ اور ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مسئلے کی صحیح تفہیم، یقیناً تلخی اور انتہا پسندی کی فضا پر صحت مندانہ اثرات چھوڑ سکتی ہے۔

علمائے دیوبند اور مولانا احمد رضا کا تصادم، یقیناً کسی ذاتی پرخاش کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ فی الاصل، دونوں فریق ایسے دو مختلف دینی مکاتبِ فکر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جو فریقین کے دور سے پیشتر ہی، برّ عظیم میں موجود تھے۔ سیّد احمد بریلوی اور ان کے اتباع اشاعتِ توحید اور ردّ بدعات پر زور دیتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنے آپ کو وہابی فکر سے ہم آہنگ بنلاتے جا رہے تھے۔ اس تحریک کا ردِّ عمل، اس شکل میں ظاہر ہوا، کہ خوش اعتقاد اہلِ سنت کے نمائندہ علماء نے اس فکر کا مقابلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے جیّد اور ذمّہ دار حنفی علماء، مذکورہ ردِّ عمل کے واضح نمائندہ بنکر منظرِ عام پر آئے۔ ریاست رامپور میں، مولانا عبد الحق خیر آبادی کے ساتھ ملاقات کے دوران مولانا احمد رضا نے، ایک بات کے جواب میں کہا تھا[۱]:

---

[۱] یہ واقعہ بالتفصیل مولانا ظفر الدین بہاری نے اپنی کتاب "حیات اعلیٰ حضرت" کے ص ۱۳۶ پر درج کیا ہے۔

"جناب والا! سب سے پہلے وہابیہ کا رد، حضرت مولانا فضل حق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضور کے والد ماجد نے کیا - اور "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغو مستقل کتاب، مولوی اسماعیل کے رد میں تصنیف فرمائی۔"

علمائے دیوبند اور مولانا احمد رضا کے زمانے تک، یہ کشمکش، نقطہ عروج کو پہنچ گئی۔ اور فکری تصادم، المیے پر منتج ہوا - المیہ اپنی جبری سی موج رواں میں، افراد یا گروہوں کو بے بسی کے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے - علمائے دیوبند اپنی جولانیٔ افکار کے انتہائی نقطے کو چھو رہے تھے - مگر مولانا احمد رضا کے حصے میں، قابل اعتراض افکار پر، تکفیر کا فریضہ شرعی ڈال دیا گیا تھا جس کی ادائیگی پر، علمائے دیوبند "شہیدانِ خنجر جور و جفا" کہلانے لگے اور احمد رضا کو "جارح ظالم اور قاتل" قرار دیا گیا - علمائے دیوبند کی مقبولیت اور مرجعیت میں کمی نہ آئی - بلکہ مظلومی کے مضمونِ تازہ نے، ان کی داستانِ غم کو مزید دلفریبی بخشدی مگر دوسری طرف، مولانا احمد رضا کو، ان کی گراں بہا علمی، دینی اور تہذیبی خدمات کے باوجود، علمی دنیا میں نظر انداز کر دیا گیا — ان کی خدمات بھلا ڈالی گئیں - بلکہ ان کے نام کو تقریباً گالی کے برابر بنا دیا گیا ؎

گر دیگر تو گشتن و مردن گناہِ من
دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہ کیست

اختلافی تلخیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے لئے، ماضی کی بعض سیا گذرگاہوں میں سے بھی گذرنا پڑے گا - بیسوی صدی کے اوائل پر برِ عظیم میں ہندو مسلم اتحاد کی تحریکیں رونما ہونے لگیں تھیں - ان تحریکوں کا ایک پہلو

ؔ میں نے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ، ایک مقامی کتب خانے میں دیکھا ہے -

یہ تھا۔ کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر انگریز حکومت کے خلاف منظم ہو جائیں اور دونوں قوموں کی متحدہ جد وجہد سے آزادی کی منزل کو قریب تر لایا جائے۔ مگر دوسرا پہلو یہ بھی تھا۔ کہ آخر مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ کس حد تک ربط قائم کر سکتے ہیں۔ اگر اتحاد کی تحریکوں میں مسلمانوں کی اپنی تہذیبی خودی ہی مضمحل ہو کر رہ گئی، تو ہندوستان کی آزادی کے بعد؛ وہ یقیناً ہندو سامراج کی غلامی قبول کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ علماء اور زعماء ان تحریکوں کے بارے میں، انہی مختلف پہلوؤں کے پیشِ نظر، مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے۔

عجیب اتفاق تھا۔ کہ اس میدان میں بھی مکتب دیوبند کے علماء اور علمائے بریلی ایک دوسرے کے مقابل ٹھہرے۔ ظاہر ہے کہ عام سیاسی تحریکوں میں، شرعی نقطۂ نظر سے کئی قابلِ اعتراض چیزیں کبھی رونما ہو جایا کرتی ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے نعروں میں، ——— ، ہندو لیڈروں کی اہمیت و عظمت خوب چمکائی گئی۔ گاندھی جی کی جے پکاری جاتی مسجدوں میں ان کی تقریریں کرائی جانے لگیں۔ اس پر مولانا احمد رضا نے گرفت کی ———

"......کوئی دقیقہ مشرکوں کی تعظیم و اعلاء میں نہ چھوڑا۔ مسلمان کہلانے والوں نے ان کی جیتیں رچے، پکاریں۔ بیل بن کر گئو بیزدوں کی گاڑیاں کھینچیں۔ ان کی مدح میں غلو و اغراق کئے۔ حتیٰ کہ گاندھی کو کہہ بھاگے ع

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے......"

(المحجۃ المؤتمنہ ص ۸۷، ۸۸)

ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و وداد کی لے یہاں تک بڑھی۔ کہ نیشنلسٹ علماء نے، ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے مسلمانوں کو گائے کی قربانی ترک کرنے کا مشورہ دینا شروع کر دیا۔ اس مسئلے پر ۱۲۹۸ھ میں مولانا احمد رضا نے ایک رسالہ "انفس الفکر فی قربان البقر" تالیف کیا۔ اس کے صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں:-

"..... اگر کسی شہر میں، بزور مخالفین، گاؤ کشی قطعاً بند کر دی جائے۔ اور بلحاظ ناراضئ ہنود، اس فعل کو، کہ ہماری شرع ہرگز اس سے باز رہنے کا ہمیں حکم نہیں دیتی۔ یک قلم موقوف کیا جائے تو کیا اس میں ذلّتِ اسلام متصور نہ ہو گی کیا اس میں خواری، و مغلوبئ مسلمین نہ سمجھی جائے گی۔ کیا اس وجہ سے ہنود کو ہم پر گردنیں دراز کرنے اور اپنی چیرہ دستی پر اعلیٰ درجہ کی خوشی ظاہر کر کے، ہمارے مذہب اہل مذہب کے ساتھ شماتت کا موقع ہاتھ نہ آئے گا....."

ظاہر ہے کہ اس میدان میں رونما ہونے والے اختلافات نے، اول الذکر اعتقادی مختلفات کے ساتھ مل کر، علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے درمیان تفریق اور تلخی کی خلیجیں اور وسیع تر کر دیں۔ مگر اس ساری صورت حال میں مولانا احمد رضا کے ساتھ، یہ خاص زیادتی ہوئی ہے کہ ان کی تمام علمی و دینی خدمات کو علم اور تاریخ کے دفتر میں کوئی جگہ نہیں دی گئی، حالانکہ فقہ اسلامی میں، ان کے کام کی نظیر مشکل ہی سے، برّ عظیم کے کسی دوسرے فقیہ کے ہاں ملے گی۔ اور حالانکہ مسلمانوں کے دینی و تہذیبی شعور کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں، ان کی خدمات، اس سرزمین کے بڑے بڑے زعماء

کی خدمات سے کچھ کم نہیں۔

مخالف نقطۂ نظر کی طرف سے بھی زیادہ سے زیادہ بات، مولانا کے خلاف یہ کہی جا سکتی ہے۔ کہ انہوں نے علمائے دیوبند سے اظہار اختلافات کیلئے نہایت سخت اور تلخ لہجہ اختیار کیا تھا۔ انہوں نے مدرسۂ دیوبند کے چند اساطین علم کی بعض عبارات کو کفریہ قرار دیا، اور اس فتوی میں، انہوں نے اس شرعی احتیاط و مراعات کو ملحوظ نہ رکھا، جو ایسے نازک موقع پر ملحوظ رکھنی ناگزیر ہوتی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ سب کچھ کہنے کہلانے کے باوجود اس طرز عمل کی معقولیت ثابت نہیں ہوتی، جو مولانا کے بارے میں، ہمارے ان تمام اہل قلم نے اختیار کیا ہے، جنہوں نے برِ عظیم کی علمی، ادبی اور دینی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے اور مولانا کی خدمات کو صاف نظر انداز کر دیا ہے۔

○

اگر تاریخ کے کسی موڑ پر، اُمت کے بعض اہل علم نے آپس میں بعض معتقدات یا بعض مسائل میں اختلاف کیا ہو، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو جاتا، کہ آنے والی نسلیں، ان اہل علم کو اور ان کے علمی کارناموں کو سپرد طاقِ نسیان کر دیں۔ پھر یہ تو اور ستم ظریفی کی بات ہے کہ دورِ اختلاف کے ایک فریق کے چہروں پر تاریخ و تذکرہ کی بھرپور روشنی نچھاور کی جائے، مگر دوسرے فریق کا ذکر ضمنی طور پر بھی کہیں نہ آنے دیا جائے۔ حالانکہ اگر ہمارے مصنفین اور اصحاب قلم، فراخدلی اور انصاف سے کام لیتے ہوئے، علمی خدمت کے انداز میں، دیوبند بریلی اختلاف کا بے لاگ تجزیہ کر دیتے اور اس اختلاف کی اہمیت کو ٹھیک طرح سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے، تو آج تک بہت سی تلخیاں دور ہو چکی ہوتیں۔ اور موجودہ نسل، علمی مفاہمت کے

نسبتہً بہتر ماحول میں داخل ہو چکی ہوتی۔

دوسری طرف خود مولانا کے ہم مشرب سُنّیوں نے، ان کے ساتھ بڑی دل چسپ مہربانیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کا عزیز ترین سرمایہ، تو اُن کا ذخیرۂ تالیفات ہی ہو سکتا تھا۔ اپنی زندگی میں جسقدر تالیفات، وہ طبع کرا سکے اپنے ذاتی خرچ سے کراتے رہے۔ اُن کے بعد، ان کی سینکڑوں تالیفات کے گراں بہا مسوّدات، گوشۂ خمول میں پڑے چلے آتے ہیں — "مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" کا نغمہ گنگنانے والی بلبلیں اور حدائقِ بخشش کے زمزمہ ہائے نعت الاپنے والی قمریاں علم و تحقیق کے اس گلبن کی طرف کم ہی پرواز کر سکیں، جو اہلسنّت کے اس دردمند مالی نے آراستہ کیا

بے شک مولانا کی شخصیت میں اور ان کے مشن میں ایک پہلو — اور بہت بڑا پہلو — جذباتی کیفیتوں کا موجود تھا۔ مگر یہ پہلو اس وابستگی او وارفتگی تک ہی محدود تھا، جو آپ کو تعلق بالرسول کے سلسلے میں حاصل تھی چنانچہ آپ کی نعتیہ شاعری کا شعبہ اسی کا ایک بھرپور اظہار ہے۔ علمی اور دینی خدمات کے دوسرے شعبوں میں آپ نے سخت حقیقت پسند کے پہلو مدِّنظر رکھے۔ مثلاً فتاویٰ رضویہ اور ردّ المحتار للشّامی پر تعلیقات کی تالیف، فقہ اسلامی کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اور ظاہر ہے، ک قانون کے سلسلے کا کوئی کام، جذباتیّت سے کس قدر دُور ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں آنے والے وابستگان کی اکثریت نے جذباتیت اور محض جذبا ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ہوتے ہوتے حقیقت پسندانہ عمل، محنت کاوِش اور ایثار و خدمت کا پہلو مغلوب ہوتا چلا گیا۔ تبلیغ، تدریس

تعلیم اور تصنیف و تالیف میں، ہر جگہ معیار گرنے لگا۔ سہل انگاری سطحیت اور نمود کا غلبہ ہوگیا۔ جب کہ مولانا احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی زندگی، دینِ مصطفوی کی خدمت کی راہوں میں، محنت و ایثار کی ایک پگھلتی ہوئی شمع تھی۔ ہماری ناقص سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اس عظیم دینی رہنما کے مشن کے ساتھ وابستگی کا صحیح تقاضا یہ تھا۔ کہ سب سے پہلے، ان کے علمِ حدیث اور علمِ فقہ پر کئے ہوئے کام کو احسن طریقے سے منظرِ عام پر لایا جاتا، اور اس کے بعد اس سلسلۂ خیر کو ہمارے دینی اداروں میں آگے جاری رکھا جاتا۔

اگر اہلِ سُنّت پر بے حسی اور مُردنی نے بالکل قابو نہیں پالیا، تو انہیں آج بھی، مشربِ حبِّ رسول کے تقاضوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ اور اپنے ائمہ کے روشن نقوش کی پیروی کرتے ہوئے، علم فقہ کی خدمت کو اپنا مختص میدان بنا لینا چاہیئے۔ تاکہ اسلامی ریاست کے قانون کی تشکیل و ترتیب نَو میں، وہ اس مقامِ رفیع کے حقدار بن سکیں۔ جو ماضی میں ہمیشہ فقہائے احناف کے لئے باعثِ شرف رہا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْ سَمَكَ السَّمَاءَ بَنیٰ لَنَا
بَیْتًا دَعَائِمُهٗ اَعَزُّ وَ اَطْوَلُ

["جس خدا نے آسمان کو رفعت بخشی، اسی نے ہمیں وہ گھر عطا کر رکھا ہے، جس کے ستون مستحکم اور بلند ہیں"]

قاضی عبدالنبی کوکب
(پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ لاہور)

۲۴ ۲ر صفر ۱۳۸۸ھ
۲۱ر مئی ۱۹۶۸ء

مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہ
مختصر سوانحی خاکہ

مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہٗ

مختصر سوانحی خاکہ

پیدائش	۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ (۱۴ جون ۱۸۵۶ء) شنبہ کے روز بریلی میں پیدا ہوئے۔
اسم گرامی	پیدائشی نام محمد رکھا گیا۔ جد امجد مولانا رضا علی خان صاحب نے "احمد رضا" کہہ کر پکارا۔ اور تاریخی نام المختار ۱۲۷۲ موزوں ہوا۔
والد بزرگوار	مولانا شاہ نقی علی خاں صاحب آپ کے والد بزرگوار تھے۔ جو علوم دینیہ ظاہرہ و باطنہ سے بہرہ مند تھے۔
تعلیم	چار برس کی عمر میں قرآن پاک ناظرہ ختم کر لیا۔ پونے چودہ برس کی عمر میں دستار فضیلت اور سند فراغت حاصل کر لی۔

اساتذہ وشیوخ

مولانا شاہ نقی علی { والد ماجد: اکثر علوم متداولہ ان سے پڑھے }۔
الشیخ صالح جمل اللیل امام شافعیہ، وشیخ الخطباء مکہ مکرمہ { شیخ الحدیث }۔
الشیخ عبد الرحمٰن السراج المفتی الحنفی مکہ مکرمہ { شیخ الفقہ }۔

سلسلۂ شیوخِ حدیث

شاہ آلِ رسول مارہروی۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
شاہ آل احمد مارہروی۔ شاہ حمزہ بلگرامی۔ سید طفیل محمد اترولوی۔ سید مبارک فخر الدین بلگرامی۔ شیخ اسمٰعیل حفید الشیخ عبد الحق۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

پہلا فتویٰ

پونے چودہ برس کی عمر میں پہلا فتویٰ تحریر فرمالیا۔

بیعت

جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۴ھ (سنہ ۱۸۷۷ء) میں حضرت سید شاہ آل رسول احمد مارہروی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

پہلا حج

سنہ ۱۲۹۵ھ میں آپ نے پہلا حج فرمایا اور روضۂ نبوی کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

دوسرا حج

سنہ ۱۳۲۲ھ میں دوسری مرتبہ سعادت حج

اور زیارت گنبد خضرا سے مشرف ہوئے۔
(اسی سفر حج کے دوران مکہ معظمہ
میں اپنی مشہور عربی کتاب الدولۃ
المکیّۃ تصنیف کی۔ جسے آٹھ گھنٹے میں
مکمل کرلیا۔

تصنیفات

ایک ہزار کے قریب ضخیم کتابیں اور رسائل
یادگار چھوڑے۔ جو موضوع کے اعتبار
سے پچاس مختلف علوم و فنون پر محیط
ہیں۔ تالیفات میں آپ کا شاہکار
ترجمہ قرآن حکیم بھی شامل ہے۔ جو اردو
تراجم میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ فتاویٰ
رضویہ (فقہ حنفی پر ۱۲ جلدوں میں) بھی ایک
معرکۃ الآراء کتاب ہے۔

مسندِ افتاء

پونے چودہ برس کی عمر سے لے کر آخر دم
تک یعنی تقریباً چوّن برس متواتر فتویٰ
نویسی کی خدمت انجام دی۔

وفات

۲۵ صفر سنہ ۱۳۴۰ ہجری (مطابق سنہ ۱۹۲۱ء)
جمعہ کے دن اپنے خالق حقیقی سے
جا ملے۔

معروف تلامذہ و خلفاء

مولانا محمد حامد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ
خلف اکبر و خلیفہ۔

ملک العلماء مولانا محمد ظفر الدین بہاری
رحمۃ اللہ علیہ۔
صدر الفقہاء مولانا محمد امجد علی رحمۃ اللہ
علیہ (مؤلف بہار شریعت)
صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین
مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (بانی جامعہ
نعیمیہ)
ابو محمد مولانا سید دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ
علیہ (بانیٔ حزب الاحناف)
مولانا الحاج محمد عبد العلیم صدیقی میرٹھی
رحمۃ اللہ علیہ (یورپ میں مبلّغ اسلام
مدینہ میں دفن ہوئے)
مفتیٔ اعظم مولانا شاہ محمد مصطفیٰ رضا خاں
مدظلہ العالی، خلف اصغر و خلیفہ۔

(مرتبہ: قاضی عبد المصطفیٰ کامل۔ ایم۔ اے)

كلامُ الامام ، امام الكلام

{ امام کا خطبہ ، خطبوں کا امام ہے }

امامِ اہلِ سُنّت

(از محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ)

[فخرِ خانوادۂ اشرفی حضرت ابوالحامد، سید محمد محدث کچھوچھوی علیہ الرحمۃ نے، شوال ۱۳۷۹ھ میں، بمقام ناگپور، "یومِ ولادت احمد رضا" کے موقع پر یہ صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا۔ محدث مرحوم، کے اس خطاب کو بعض سامعین نے نقل کرلیا تھا۔ اس طرح یہ اہم گفتگو محفوظ ہو گئی۔ ہم اس خطبے کو، نسیم بستوی صاحب کی تالیف "مجدد اسلام" سے نقل کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ خطبے کے بعض مقامات پر کچھ خفیف سے تسامحات ناقل (جس نے مجلس میں تقریر قلمبند کی تھی) سے سرزد ہوئے ہیں، اور کچھ مزید رنگ آمیزی کاتب کے قلم نے کردی ہے۔ ہم نے اپنی سمجھ کی حد تک اصلاح کی کوشش کی ہے۔ جہاں، واضح اور قطعی نوعیت کی کتابت کی غلطی محسوس ہوئی ہے۔ وہاں بغیر کسی نشاندہی کے، تصحیح کردی گئی ہے اور جہاں کسی لفظ کی کمی، یا فقرے میں، بھول کا احساس ہوا ہے، وہاں قوسین کی مدد سے اصلاح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خطبے میں بعض علمی اختلافات کے حامل مباحث بھی شامل تھے۔ مگر انہیں ہم نے

حذف کرتے ہوئے، محض سوانح پر مشتمل حصص پیش کر دیے ہیں)۔
(مرتبین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الاحد رضاء لسیدنا احمد واصلی واسلم علی سیدنا احمد رضاء اللہ الواحد الصمد وعلی جمیع من رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ احمد الرضاء من الازل الی الابد اما بعد۔

پیارے سنی بھائیو!

یادگار منانے پر عقلی و نقلی دلیل

ہمارا اور آپ کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ زندہ قومیں، ان کی قومیت کی شیرازہ بندی جس کے ہاتھوں سے ہو چکی، اس کی یادگار مناتی ہیں اور اس کو اپنی قومی زندگی کا بیمہ سمجھتی ہیں۔ دنیا نے مان لیا ہے کہ جو قوم اپنے قومی محسنوں کو بھول گئی تو زندگی نے ساری قوم کو بھلا دیا اور موت کے منہ میں ڈال دیا۔ یہ قومیت کا فطری جذبہ نہ کسی دلیل نقلی کا محتاج ہے نہ برہان عقلی کا، اس کا تعلق صحیح انسانیت اور درستی ہوش وحواس سے ہے جو افراد محسنین قوم کی یادگار منانے سے چڑنے لگتے ہیں تو ان کو دنیا نے نہ صرف یہ کہ قومیت سے خارج قرار دیا بلکہ انہیں ایک خاص قسم کا پاگل سمجھ لیا گیا۔

یادگار منانا چونکہ فطری جذبہ ہے۔ لہذا اسلام جس کا دوسرا نام ہی دین فطرت ہے اس میں اس جذبہ کو اجاگر رکھنے کی تعلیم اپنے روحانی انداز میں بہت صاف وصریح ہے، یہ جو قرآن عظیم میں ارشاد ہوا کہ " وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ " اللہ تعالیٰ کے دنوں کو یاد دلاتے رہو تو یوں تو سب دن اللہ کے ہیں مگر کچھ ایسے

دن بھی تو ہیں جن دنوں کو خاصان حق و برگزیدان حق نے خصوصیات عطا فرما دیں اور جن کی یاد سے اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے جس کے اذن و عطا نے اس دن کو سنوار دیا۔ ایسے دن جس کی بدولت حاصل ہوں اس کا گویوم ولادت سے وقت وفات تک کا ہر دن اور وفات سے لے کر حشر تک کا ہر دن۔ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی والے آقا کے وسعت دامان میں پلتا ہی رہتا ہے اور بڑھتا ہی رہتا ہے۔ مگر ان سارے دنوں میں انتخاب قدرت، یوم پیدائش و یوم وصال ویوم حشرونشر ہے۔

امام بریلوی قدس سرہٗ کی یادگار

تیرھویں صدی کی یہ واحد شخصیت تھی جو ختم صدی سے پہلے علم و فضل کا آفتاب فضل و کمال ہو کر اسلامیات کی تبلیغ میں عرب و عجم پہ چھا گئی اور چودھویں صدی کے شروع ہی میں پورے عالم اسلامی میں اس کو حق و صداقت کا منارۂ نور سمجھا جانے لگا۔ تیری طرح سے سارے حل وحرم کو اس کا اعتراف ہے کہ اس فضل و کمال کی گہرائی اور اس علم راسخ کے کوہ بلند کو آج تک کوئی نہ پا سکا۔

وائس چانسلر علی گڑھ امام بریلوی کی خدمت میں

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب بہاری مرحوم۔ مسلم یونیورسٹی کے ڈین تھیالوجی

۱؎ حضرت مولانا سلیمان اشرف اعلیٰ حضرت مولانا بریلوی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ ان کی شخصیت پر مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک نہایت پر تاثیر خاکہ تحریر فرمایا تھا جو ان کے مجموعہ مضامین "گنج ہائے گراں مایہ" میں شامل ہے۔ (مرتبین)

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو لے کر جب اس لیے حاضر خدمت ہوئے کہ ایشیا بھر میں ڈاکٹر صاحب ریاضی و فلسفہ میں فرسٹ کلاس کی ڈگری رکھتے ہوئے ایک مسئلہ کو حل کرنے میں زندگی کے قیمتی سال لگا کر بھی حل نہ کرنے پائے تھے اور فیثا غورثی فلسفہ کشش ان پر چھایا ہوا تھا تو اعلیٰ حضرت نے عصر و مغرب کی درمیانی مختصر مدت میں مسئلہ کا حل بھی قلمبند کرا دیا اور فلسفہ کشش کی کھینچ تان کو بھی قلمبند فرما دیا جو رسالہ کی شکل میں چھپ چکا ہے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب حیران تھے کہ ان کو یورپ کا کوئی تھیوریوں والا درس دے رہا ہے یا اسی ملک کا کوئی حقیقت آشنا ان کو سبق پڑھا رہا ہے انہوں نے اس صحبت کے تاثرات کو اجمالاً یہ کہا تھا کہ اپنے ملک میں جب معقولات کا ایسا ایکسپرٹ موجود ہے تو ہم نے یورپ جا کر جو کچھ سیکھا اپنا وقت ضائع کیا۔[1]

معقولات میں امام بریلوی کا مقام

یہ روز کا معمول تھا کہ فلکیات و ارضیات کے ماہرین اپنے علمی مشکلات کو لے کر آتے اور دم بھر میں حل فرما کر ان کو شاد شاد رخصت فرما دیتے۔ میں نے تو یہ بھی دیکھا کہ ماہرین فنِ نجوم آئے اور فنی دشواریوں کو پیش کیا تو اعلیٰ حضرت نے ہنستے ہنستے اس طرح جواب دے کر خوش کر دیا کہ گویا یہ دشواری اور اس کا حل پہلے سے فرمائے ہوئے تھے۔ ایک بار صدرا کے مایۂ ناز (مقامات) تشکل حماری اور تشکل عروسی کے بارے میں مجھ سے سوال فرما کر جب کتابی جواب کی وہی کیفیت دیکھی تو اپنی تحقیق بیان فرمائی تو میں نے محسوس کیا کہ حماری کی دحماریت؟ع

---

[1] اس واقعہ کو حضرت محدث صاحب نے نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ مفصل واقعہ "حیات اعلیٰ حضرت" میں ملاحظہ کیا جائے۔

بے پردہ ہوگئی اور عروسی کا عروس ختم ہوگیا۔ مسئلہ بحث واتفاق شمس بازغہ کا سرمایہ تفلسفت ہے مگر اس بارے میں اعلیٰ حضرت کے ارشادات جب مجھ کو ملے تو اقرار کرنا پڑا کہ مُلّا محمود آج ہوتے تو اعلیٰ حضرت کی طرف رجوع کرنے کی حاجت محسوس کرتے۔ اعلیٰ حضرت نے کسی ایسے نظریئے کو کبھی صحیح وسلامت نہ رہنے دیا جو اسلامی تعلیمات سے متصادم رہ سکے اگر آپ وجود فلک کو جاننا چاہتے ہوں اور زمین وآسمان دونوں کا سکون سمجھنا چاہتے ہوں اور ستاروں کے بارے میں کل فی فلک یسبحون کو ذہن نشین کرنا چاہتے ہوں تو ان رسائل کا مطالعہ کریں جو اعلیٰ حضرت کے رشحات قلم ہیں اور یہ راز آپ پر ہر جگہ کھلتا جائے گا کہ منطق وفلسفہ وریاضی والے اپنی راہ کے کس موڑ پر کج رفتار ہوجاتے ہیں۔

امام کے علوم وفنون سے میری حیرانی

علوم وفنون کا کیا حال تھا اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آج کی علمی دنیا پچاس علوم وفنون کے نام سے بے خبر ہے ـــــ اور اعلیٰ حضرت کے قلم مبارک سے پچاس علوم وفنون کے مبسوط رسائل تیار ہیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے نماز عصر کے لیے وضو فرماتے ہوئے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ سبع عرض شجرہ کا حساب یونانیوں نے جس دن سے کیا تھا اب دنیا پر ظاہر ہوگیا کہ یونان بلکہ دنیا کے ہر پہاڑ سے بلند کوہ ہمالیہ کی ایورسٹ چوٹی ہے کیا اس سے حساب لگا دوگے۔ میں نے دو دن کی مہلت مانگی اور رات دن صفحات کو سیاہ کرتا ہوا جب صحیح حساب تیار کرکے حاضر ہوا تو فرمایا۔ تو کیا آپ کا جواب یہ ہے؟ میں نے ہاں تو عرض کردیا مگر حیران تھا کہ جس حساب میں میرا مغز سر سد کھ گیا وہ برجستہ ارشاد فرمانے والا صرف ایک عالم ہے یا وہ ایسا ہے کہ لغت میں اس کے لیے کوئی لفظ ہی نہیں

ہے۔ میرے صحیح جواب پر جو دعائیں فرمائیں آج وہ ہی میرے لئے سب کچھ ہیں۔

امام بریلوی کے مسلم کمالات میرے مشاہدہ میں

آج میں آپ کو جگ بیتی بلکہ آپ بیتی سنا رہا ہوں کہ جب تکمیل درس نظامی و تکمیل درس حدیث کے بعد میرے مربیوں نے کارِ انتہا کے لئے اعلیٰ حضرت کے حوالہ کیا زندگی کی یہی گھڑیاں میرے لئے سرمایۂ حیات ہو گئیں اور میں محسوس کرنے لگا کہ آج تک جو کچھ پڑھا تھا وہ کچھ نہ تھا اور اب ایک دریائے علم کے ساحل کو پالیا ہے علم کو راسخ فرمانا اور ایمان کو رگ و پے میں اتار دینا اور صحیح علم دے کر نفس کا تزکیہ فرما دینا یہ وہ کرامت تھی جو ہر ہر منٹ پر صادر ہوتی رہتی تھی۔

افتاء کی خداداد عظیم صلاحیت

عادتِ کریمہ تھی کہ استفتاء ایک ایک مفتی کو تقسیم فرما دیتے اور پھر ہم لوگ دن بھر محنت کر کے جوابات مرتب کرتے پھر عصر و مغرب کی درمیانی مختصر ساعت میں ہر ایک سے پہلے استفتاء پھر فتویٰ سماعت فرماتے اور بیک وقت سب کی سنتے اسی وقت مصنفین اپنی تصنیف دکھاتے، زبانی سوال کرنے والوں کو بھی اجازت تھی کہ جو کہنا چاہیں کہیں اور جو سنانا ہو سنائیں اتنی آوازوں میں اس قدر جداگانہ باتیں اور صرف ایک ذات کو سب کی طرف توجہ فرمانا۔ جوابات کی تصحیح و تصدیق و اصلاح، مصنفین کی تائید و تصحیح اغلاط، زبانی سوالات کا تشفی بخش جواب عطا ہو رہا ہے اور فلسفیوں کے اس خبط کی لَا یَصْدُرُ عَنِ الْوَاحِدِ اِلَّا الْوَاحِدُ [" ایک ہستی سے ایک وقت میں ایک ہی چیز صادر ہو سکتی ہے"]۔ کی دھجیاں اڑ رہی ہیں جس ہنگامہ سوالات و جوابات میں بڑے بڑے اکابر علم و فن سر تھام کر چپ ہو جاتے ہیں کہ کس کس کی سنیں اور کس کس کی نہ سنیں

وہاں سب کی شنوائی ہوتی تھی اور سب کی اصلاح فرمادی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ادبی خطا پر بھی نظر پڑ جاتی تھی اور اس کو درست فرمادیا کرتے تھے۔

حیرت انگیز قوتِ حافظہ

یہ چیز روز پیش آتی تھی کہ تکمیل جواب کے لیے جزئیات فقہ کی تلاش میں جو لوگ تھک جاتے تو عرض کیے، اسی وقت فرمادیتے کہ ردالمختار جلد فلاں کے صفحہ فلاں کی سطر فلاں میں ان لفظوں کے ساتھ جزئیہ موجود ہے۔ درمختار کے فلاں صفحہ فلاں سطر میں یہ عبارت ہے۔ عالمگیری میں بقید جلد و صفحہ و سطر یہ الفاظ موجود ہیں۔ ہندیہ میں، خیریہ میں، مبسوط میں، ایک ایک کتاب فقہ کی اصل عبارت بقید صفحہ و سطر یہ الفاظ موجود ہیں۔

ارشاد فرمادیتے اب جو کتابوں میں جاکر دیکھتے تو صفحہ و سطر و عبارت وہی پاتے جو زبانِ اعلیٰ حضرت نے فرمایا تھا اس کو آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خداداد قوتِ حافظہ سے ساری چودہ سو برس (۱۴۰۰) کی کتابیں حفظ تھیں یہ چیز بھی اپنی جگہ پر حیرت ناک ہے مگر میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ حافظ قرآن کریم نے سالہا سال قرآن عظیم کو پڑھ کر حفظ کیا روزانہ دہرایا ایک ایک دن میں سو سو بار دیکھا حافظ ہوا محراب سنانے کی تیاری میں سارا دن کاٹ دیا اور صرف ایک کتاب سے واسطہ رکھا۔ حفظ کے بعد سالہا سال مشغلہ رہا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی حافظ کو تراویح میں لقمے کی حاجت نہ پڑی ہو گو ایسا دیکھا نہیں گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ حافظ صاحب کسی آیت قرآنیہ کو سن کر اتنا یاد رکھیں کہ ان کے پاس جو قرآن کریم ہے اس میں یہ آیۂ کریمہ داہنی جانب ہے یا بائیں جانب ہے۔ گو یہ بھی بہت نادر چیز ہے مگر یہ تو عادتاً محال اور بالکل محال ہے کہ آیت قرآنیہ کے صفحہ و سطر کو بتایا جاسکے تو کوئی بتلائے کہ تمام کتب متداولہ و غیر متداولہ کے ہر جملہ کو بقید صفحہ و سطر بتلانے والا اور پورے اسلامی کتب خانے کا صرف حافظ ہی ہے یا وہ اعلیٰ کرامت کا

نمونۂ ربانیہ ہے جس کے بلند مقام بیان کرنے کے لئے اب تک ارباب لغت و اصطلاح لفظ پانے سے عاجز رہے ہیں۔

میری شرارت

مجھے اپنی یہ شرارت یاد ہے کہ جان بوجھ کر اپنے جانے بوجھے جزئیات فقہ کو دریافت کرتا تو اعلیٰ حضرت مسکرا کر بتا دیتے اور مزید حوالے عطا فرماتے مع صفحہ و سطر و عبارت نوٹ کر لیتا کہ شاید کبھی صفحہ یا سطر یا عبارت میں کسی لفظ و نقطہ کی بھول ہو جائے۔ مگر آج میں بڑی مسرت کے ساتھ باقرار صالح اپنا بیان دیتا ہوں کہ میری شریرانہ خواہش ہمیشہ ناکام رہی۔

حیرت انگیز علم حساب

چونکہ میں نے حساب کی تعلیم سکولی طور پہ پائی تھی لہذا فرائض حساب کی مشق بڑھی ہوئی تھی اور ایسے استفتا میرے سپرد فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ پندرہ بطن کا مناسخہ آیا ظاہر ہے کہ مورث اعلیٰ کی پندرھویں پشت میں درجنوں ورثاء ہوں گے مجھ کو اس کے جواب میں دو رات اور ایک دن مسلسل محنت کرنی پڑی اور آنہ پائی سے درجنوں ورثاء کے حق کو قلمبند کر دیا نماز عصر کے بعد بیٹھا کہ استفتا سناؤں وہ بہت طویل تھا۔ فلاں مرا، اور فلاں کو وارث چھوڑا پھر فلاں مرا اور اس نے اتنے وارث چھوڑے اس میں صرف ناموں کی تعداد اتنی بڑی تھی کہ فل سکیپ سائز کے دو صفحے بھرے ہوئے تھے۔ جب یہ استفتاء میں پڑھ رہا تھا تو دیکھا کہ اعلیٰ حضرت کی انگلیاں حرکت میں ہیں ادھر استفتاء ختم ہوا ادھر بلا کسی تاخیر کے ارشاد فرمایا کہ آپ نے فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا، درجنوں نام بنام لوگوں کا حصہ بتا دیا۔ اب میں حیران و ششدر کہ استفتاء کو بیس مرتبہ تو میں نے پڑھا ہر ایک نام کو بار بار پڑھ کر ان کا حصہ قلمبند کیا لیکن مجھ سے صرف سیب الاحیاء (زندہ ورثاء) کا نام کوئی پوچھے تو بغیر استفتاء اور جواب کو دیکھے

نہیں بتا سکتا۔ یہ کیا تبحر، کیا وسعتِ مدارک، توبہ توبہ! یہ کتنی شاندار کرامت ہے کہ ایک بار استفتا رسنا تو درجنوں ورثا کا ایک ایک نام یاد رہا اور ہر ایک کا صحیح حصہ اس طرح بتا دیا کہ جیسے کئی مہینے تک کوشش کر کے حصہ و نام کو رٹ لیا گیا ہو۔

میری عرض و تمنا میں اس سرکار میں کس قدر شوخ تھا یا شوخ بنا دیا گیا تھا اپنا جواب اعلیٰ حضرت کی نشست کی چارپائی پر رکھ کر عرض کرنے لگا کہ اس علم کا کوئی حصہ عطا نہ ہوگا جس کا علمائے کرام میں نشان بھی نہیں ملتا مسکرا کر فرمایا کہ میرے پاس علم کہاں جو کسی کو دوں۔ یہ تو آپ کے جدِ امجد سرکار غوثیت کا فضل و کرم ہے اور کچھ نہیں۔ یہ جواب مجھ ننگ خاندان کے لیے تازیانۂ عبرت بھی تھا کہ لوٹنے والے لوٹ کر خزانے والے ہو گئے اور میں "پدرم سلطان بود" کے نشہ میں پڑا رہا اور یہ جواب اس کا بھی نشان دیتا تھا کہ علم راسخ والے مقام تواضع میں کیا ہو کر اپنے کو کیا کہتے ہیں۔ یہ شوخی میں نے بار بار کی اور یہی جواب عطا ہوتا رہا۔ اور ہر مرتبہ میں ایسا ہو گیا کہ میرے وجود کے سارے کل پرزے معطل ہو گئے ہیں۔

علمِ قرآن علم قرآن کا اندازہ اگر صرف اعلیٰ حضرت کے اس اردو ترجمے سے کیجئے جو اکثر گھروں میں موجود ہے اور جس کی کوئی مثال سابق نہ عربی زبان میں ہے نہ فارسی میں اور نہ اردو میں۔ اور جس کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر ایسا ہے کہ دوسرا لفظ اس جگہ لایا نہیں جا سکتا جو بظاہر محض ترجمہ ہے مگر درحقیقت وہ قرآن کی صحیح تفسیر اور اردو زبان میں (روح) قرآن ہے۔ اس ترجمہ کی شرح حضرت صدر الافاضل استاذ العلماء مولانا نعیم الدین علیہ الرحمۃ نے حاشیہ پر لکھی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ دوران شرح میں ایسا

کئی بار ہوا کہ اعلیٰ حضرت کے استعمال کردہ لفظ کے مقام استنباط کی تلاش میں دن پر دن گذرے اور رات پر رات کٹتی رہی اور بالآخر ماخذ ملا تو ترجمہ کا لفظ اٹل ہی نکلا۔ اعلیٰ حضرت خود شیخ سعدی کے فارسی ترجمہ کو سراہا کرتے تھے لیکن اگر حضرت سعدی اردو زبان کے اس ترجمہ کو پاتے تو فرما ہی دیتے کہ ترجمہ قرآن شے دیگر است وعلم القرآن شے دیگر۔

علم الحدیث وعلم الرجال علم الحدیث کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جتنی حدیثیں فقہ حنفی کی ماخذ ہیں۔ ہر وقت پیش نظر۔ اور جن حدیثوں سے فقہ حنفی پر بظاہر زد پڑتی ہے اس کی روایت و درایت کی خامیاں ہر وقت ازبر۔ علم الحدیث میں سب سے نازک شعبہ علم اسماء الرجال کا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے سامنے کوئی سند پڑھی جاتی۔ اور راویوں کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو ہر راوی کی جرح و تعدیل کے جو الفاظ فرما دیتے تھے اٹھا کر دیکھا جاتا تو تقریب و تہذیب و تذہیب میں وہی لفظ مل جاتا تھا اس کو کہتے ہیں علم راسخ اور علم سے شغف کامل اور علمی مطالعہ کی وسعت۔

اعلیٰ حضرت نے اس (حقیقت)، کو (واضح) فرما دیا کہ...... (بعض لوگوں)، کا ایمان بالرسل بایں معنی نہیں ہے کہ رسول پاک سید المرسلین ہیں۔ خاتم النبیین ہیں۔ شفیع المذنبین ہیں۔ اکرم الاولین والآخرین ہیں۔ اعلم الخلق اجمعین ہیں۔ محبوب رب العٰلمین ہیں بلکہ صرف بایں معنیٰ ہے کہ زیادہ سے زیادہ بڑے بھائی ہیں جو مر کر مٹی میں مل چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے بے اختیار اور عنداللہ تعالیٰ بے وجاہت رہے۔ اگر ان کو بشر سے کم قرار دو، تو تمہاری توحید زیادہ چمکدار ہو جائے گی۔ ان حقائق کے واضح کر دینے کا یہ مقدس نتیجہ ہے کہ آج مسلمانوں کی جمہوریت اسلامیہ بڑی اکثریت کے ساتھ دامن رسول سے لپٹی

ہوئی ہے اور دشمنانِ اسلام کے فریب سے بچ کر مجرموں کے منہ پر تھوک رہی ہے۔
فجزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن سائر اہل السنۃ والجماعۃ خیر الجزاء

امام بریلوی قدس سرہٗ کاملین کی نگاہ میں

میرے استاد، فنِ حدیث کے امام[1] کو بیعت حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (قدس سرہٗ العزیز) سے تھی مگر حضرت کی زبان پر پیر و مرشد کا ذکر میرے سامنے کبھی نہ آیا۔ اور اعلیٰ حضرت کے بکثرت تذکرے محبت کے ساتھ فرماتے تھے، میں اس وقت تک بریلی حاضر نہ ہوا تھا۔ اس انداز کو دیکھ کر میں نے ایک دن عرض کیا کہ آپ کے پیر و مرشد کا تذکرہ نہیں سنتا۔ اور اعلیٰحضرت کا آپ خطبہ پڑھتے رہتے ہیں۔ فرمایا کہ جب میں نے پیر و مرشد سے بیعت کی تھی بایں معنیٰ مسلمان تھا کہ میرا سارا خاندان مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب میں اعلیٰ حضرت سے ملنے لگا تو مجھ کو ایمان کی حلاوت مل گئی۔ اب میرا ایمان رسمی نہیں ہے بلکہ بعونہٖ تعالیٰ حقیقی ہے جس نے حقیقی ایمان بخشا اس کی یاد سے اپنے دل کو تسکین دیتا رہتا ہوں۔ حضرت کا اندازِ بیان اور اس وقت چشم پرنم۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ واقعی ولی را ولی می شناسد اور عالم را عالم می داند۔ میں نے عرض کیا کہ علم الحدیث میں کیا وہ آپ کے برابر ہیں۔ فرمایا کہ ہرگز نہیں پھر فرمایا کہ شہزادہ صاحب آپ کچھ سمجھے کہ ہرگز نہیں کا کیا مطلب ہے سنئے کہ اعلیٰ حضرت اس فن میں امیر المومنین فی الحدیث ہیں کہ میں سالہا سال صرف اس فن میں

---

[1] اس سے مولانا وصی احمد محدث سورتی رحمۃ اللہ علیہ مراد ہیں۔ جو محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب خطبہ) کے استاذ اور فاضل بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے معاصرین و معتقدین میں تھے (شرف قادری)

تلمذ کروں تو بھی ان کا پاسنگ نہ ٹھہروں۔

بریلی کی طرف میری کشش

حضرت محدث صاحب قبلہ (مولانا وصی احمد) کے اسی قسم کے ارشادات نے میرے دل کو بریلی کی طرف کھینچا اور بالآخر آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اعلیٰ حضرت کیا ہیں۔ اس کا اندازہ بڑے سے بڑا مبصر بھی نہیں کر سکتا۔

اندازِ تربیت

ذرا اندازِ تربیت دیکھئے کہ کار افتاء کے لئے جب بریلی حاضر ہوا تو میرے اندر لکھنؤ میں ۸ سال رہنے کے باعث لکھنوی انداز کی خو بو کافی موجود تھی شہر کے جغرافیہ میں بازار اور تفریح گاہوں کو وہاں کے لوگوں سے پوچھتا رہا۔ کہ جمعہ کے دن کی فرصت میں کچھ سیر سپاٹا کروں۔ جمعہ کا دن آیا تو میں مسجد میں سب سے پہلی صف میں تھا۔ نماز ہو گئی تو مجھے دریافت فرمایا کہ کہاں ہیں۔ میں بریلی کے لئے بالکل نیا شخص تھا۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے یہاں تک کہ اعلیٰ حضرت خود کھڑے ہو گئے اور باب مسجد پر مجھ کو دیکھ لیا تو مصلے سے اُٹھ صف آخر میں آ کر مجھ کو مصافحہ سے نوازا اس سے زیادہ کا ارادہ فرمایا تو میں تھرا کر گر پڑا۔ اعلیٰ حضرت پھر مصلے پر تشریف لے گئے اور سنن و نوافل ادا فرمانے لگے۔ مسجد کے ایک ایک شخص نے اس کو دیکھا اور بڑی حیرت سے دیکھا۔ میں نے بازار اور کتب خانے کی سیر کو طے کر رکھا تھا شام کو جب چلا تو شہامت گنج کے موڑ پر پہلے پان کھانے کی خواہش ہوئی ابھی پان والے سے کہا بھی نہ تھا کہ ہر طرف سے السلام علیکم آئے اور مجھ کو جواب دینا پڑے۔ اب پان والے کی دکان کے سامنے کھڑا ہونا بھی دشوار ہو گیا۔ سلام و مصافحہ کی برکت نے سارا پروگرام ختم کر دیا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ بریلی کا ذکر نہیں۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس میں بھی پاپیادہ نہیں بلکہ موٹر میں بیٹھ کر بھی

صرف سیر بازار کے لیئے نہیں نکلا۔ سارا لکھنوی انداز ہمیشہ کے لیئے ختم فرمادیا۔

غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حیرت انگیز عقیدت

دوسرے دن کار افتاء پہ لگانے سے پہلے خود گیارہ روپیہ کی شیرینی منگائی۔ اپنے پلنگ پر مجھ کو بٹھا کر اور شیرینی رکھ کر فاتحہ غوثیہ پڑھ کر دست کرم سے شیرینی مجھ کو بھی عطا فرمائی اور حاضرین میں تقسیم کا حکم دیا۔ کہ اچانک اعلیٰ حضرت پلنگ سے اٹھ پڑے سب حاضرین کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا کہ شاید کسی شدید حاجت سے اندر تشریف لے جائیں گے لیکن حیرت بالائے حیرت یہ ہوئی کہ اعلیٰ حضرت زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے دیکھا تو یہ دیکھا کہ تقسیم کرنے والے کی غفلت سے شیرینی کا ایک ذرہ زمین پر گر گیا تھا۔ اور اعلیٰ حضرت اس ذرے کو نوک زبان سے اٹھا رہے ہیں اور پھر اپنی نشست گاہ پر بدستور تشریف فرما ہوئے۔ اس کو دیکھ کر سارے حاضرین سرکار غوثیت کی عظمت و محبت میں ڈوب گئے اور فاتحہ غوثیہ کی شیرینی کے ایک ایک ذرے کے تبرک ہو جانے میں کسی دوسری دلیل کی حاجت نہ رہ گئی اور اب میں نے سمجھا کہ بار بار مجھ سے جو فرمایا گیا کہ میں کچھ نہیں یہ آپ کے جد امجد کا صدقہ ہے وہ مجھے خاموش کر دینے کے لیئے ہی نہ تھا، اور نہ صرف مجھ کو شرم دلانا ہی تھی، بلکہ درحقیقت اعلیٰ حضرت غوث پاک کے ہاتھ میں "چوں قلم در دست کاتب" تھے جس طرح کہ غوث پاک سرکار دو عالم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاتھ میں "چوں قلم در دست کاتب" تھے اور کون نہیں جانتا کہ رسول پاک اپنے رب کی بارگاہ میں ایسے تھے کہ قرآن کریم نے فرمادیا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

امام بریلوی قدس سرّہٗ کا لغزشوں سے محفوظ رہنا

علمائے دین کے اعلیٰ کارنامے چودہ صدی سے چلے آرہے ہیں۔ مگر لغزش قلم وفلتت لسان سے بھی محفوظ رہنا یہ اپنے بس کی بات نہیں۔ زورِ قلم میں بکثرت تفرد پسندی میں آگئے بعض تجدد پسندی پر اتر آئے تصانیف میں خود رائیاں بھی ملتی ہیں۔ لفظوں کے استعمال میں بھی بے احتیاطیاں ہو جاتی ہیں۔ قولِ حق کے لہجہ میں بھی بوئے حق نہیں ہے حوالہ جات میں اصل کے بغیر نقل پر ہی قناعت کرلی گئی ہے لیکن ہم کو اور ہمارے ساتھ سارے علمائے عرب وعجم کو اعتراف ہے کہ یا حضرت شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی یا حضرت مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی یا پھر اعلیٰ حضرت کی زبان وقلم کا یہ حال دیکھا کہ مولا تعالیٰ نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اور زبان وقلم نقطہ برابر خطا کرے اس کو ناممکن فرما دیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ اس عنوان پر غور کرنا ہو تو فتاویٰ رضویہ کا گہرا مطالعہ کر ڈالیے۔

امام بریلوی کی شعر گوئی

کتنی عجیب بات ہے کہ ایسے امام الوقت مسند العصر کے پاس جس کو رات دن کے کم سے کم بیس گھنٹے میں صرف علم دین سے واسطہ ہو جس کے ایوان علم میں اپنے ساتھ قلم دوات اور دینی کتابوں کے سوا کچھ نہ ہو جو عرب وعجم کا رہنما ہو اس کو شعر کہنے کو کیا کہا جائے کسی سے شعر سننے کی فرصت کہاں سے ملتی ہے مگر شانِ جامعیت میں کمی کیسے ہو اور ممکن شاعری میں برکت کہاں سے آتے اگر اعلیٰ حضرت کے قلم اس کو نہ نوازیں حضرت حسان رضی اللہ عنہ جس رشک جناں سے سرفراز تھے اس کی طلب تو ہر عاشق کے لیے سرمایۂ حیات ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت کے حمد ونعت کا ایک مجموعہ کئی حصوں میں شائع ہو چکا ہے جس کا ایک ایک لفظ پڑھنے والوں

اور سننے والوں کو مستی عطا کرتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ کے ادیبوں کی ایک شاندار محفل میں اعلیٰ حضرت کا قصیدۂ معراجیہ میں نے اپنے انداز میں پڑھا تو سب جھومنے لگے میں نے اعلان کیا کہ اردو ادب کے نقطۂ نظر سے میں ادیبوں کا فیصلہ اس قصیدہ کی زبان کے متعلق چاہتا ہوں تو سب نے کہا کہ اس کی زبان تو کوثر کی دھلی ہوئی زبان ہے۔

اس قسم کا ایک واقعہ دہلی میں پیش آیا تو سر آمد شعراء دہلی نے جواب دیا کہ ہم سے کچھ نہ پوچھئے آپ عمر بھر پڑھتے رہیئے اور ہم عمر بھر سنتے رہیں گے۔

فن زیجات و فن تکسیر | فن زیجات و فن تکسیر میں شان امامت کے نمونے آج اعلیٰ حضرت کے تلامذہ سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ارشد تلامذہ میں حضرت ملک العلماء ظفر الملۃ والدین اس عہد میں دونوں فن کے ماہر مانے جا رہے ہیں۔ علم جفر میں اعلیٰ حضرت ساری دنیا میں فرد یکتا تھے۔ بڑے بڑے مدعیان فن مستظہرہ تک پہنچ کر آگے معذور ہو جاتے ہیں اور ان کے حساب میں جواب سے پہلے کوئی نہ کوئی کسر آ جاتی ہے بڑے بڑے رمال و جفار نے اعتراف کیا کہ ہم اعلیٰ حضرت کے آگے طفل دبستان ہیں۔

عجیب واقعہ | اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آ گیا کہ حضرت مولانا ہدایت رسول رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ریاست رامپور میں علمی منصب پر تھے۔ نواب صاحب کی بیگم بیمار پڑیں جن کی بیماری نواب صاحب کے لئے ناقابل برداشت تھی ان کو بیماری کا انجام جاننے کے لئے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں بھیجا۔ پہلے تو اعلیٰ حضرت نے ٹال دیا مگر مولانا کا سوکھا سا منہ دیکھ کر رحم آ گیا اور لکھ کر دیدیا کہ اگر رفض سے توبہ نہ کی تو اسی ماہ محرم میں رامپور کے اندر مر جائے گی۔ نواب صاحب نے طے کر لیا کہ ماہ محرم تو روکا نہیں جا سکتا مگر رامپور سے چلا جانا ممکن

ہے مع بیگم کے نینی تال چلے گئے کہ وہاں موت واقع ہوئی تو وہ نینی تال سے رامپور
نہیں ہے مگر وہ جو کہ فرمایا گیا ہے جف القلم بما ھو کائن۔ آخر یہ ہو کر رہا
کہ کانپور کی مسجد شہید گنج کے ہنگامے میں لفٹنٹ گورنر مسٹر مسٹن کی بے چینی حد
سے بڑھی تو نواب صاحب کو تار دیا کہ رامپور آتا ہوں جلد آکر ملو۔ نواب صاحب
اکیلے جانے کو تیار ہوئے تو بیگم نے نہ مانا اور بالآخر دونوں ماہ محرم میں جیسے ہی
رامپور پہنچے کہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔

وفات شریف کی غائبانہ اطلاع میں اپنے مکان پر تھا اور بریلی کے حالات سے بے خبر تھا میرے حضور
شیخ المشائخ قدس سرہٗ العزیز وضو فرما رہے تھے کہ یکبارگی رونے لگے یہ بات کسی
کی سمجھ میں نہ آئی کہ کیا کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ میں آگے بڑھا تو فرمایا کہ
بیٹا میں فرشتوں کے کاندھے پر قطب الارشاد کا جنازہ دیکھ کر رو پڑا ہوں۔
چند گھنٹے کے بعد بریلی کا تار ملا تو ہمارے گھر میں کہرام پڑ گیا۔ اس وقت حضرت والد
ماجد قبلہ قدس سرہٗ کی زبان پر بے ساختہ آیا کہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ اسی وقت
ایک خاندانی بزرگ نے فرمایا کہ اس سے تو تاریخ وصال نکلتی ہے۔ آج ہم اور
آپ اسی یکتائے روزگار امام و مجدد قطب الارشاد کی بارگاہ عالی میں نذرانہ عقیدت
پیش کرنے کو جمع ہیں اور ان کی روح مبارک کی سُنّیت نوازی سے دارین کا
آسرا لگائے ہوئے ہیں۔

فرحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و رضی اللہ تعالیٰ احمد رضاء

فقط

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست
ملّتے را می برد در کوئے دوست

(اقبال)

رضا کا مقامِ فقہ

[" رضا کا مقامِ فقہ " کے عنوان سے، یہ مقالہ، ہماری درخواست پر، مفتی اعجاز ولی خاں صاحب رضوی نے تحریر فرمایا ہے۔ آپ مدارسِ دینیہ عربیہ کے پختہ مدرس ہیں۔ اور صاحبِ یوم کے ساتھ سندِ تلمّذ کے علاوہ، علاقۂ نسبی بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے اس مقالے میں عربی دان فضلاء کے مشکل پسندانہ اسلوب کے اثرات بھی موجود ہیں، اور صاحبِ یوم شخصیت کے ساتھ انتہائی خوش اعتقادی کی جھلکیاں بھی۔ تاہم یہ مقالہ مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ مرتّبین نے مقالہ نگار سے، ضروری حکّ وحذف کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اور بعض مقامات پر، اس حق کو استعمال بھی کیا گیا ہے]۔

(مُرتّبین)

اللہ لا الٰہ سواہ نحمدہ و نصلی علی حبیبہ الکریم

معزز صدر گرامی اور ذوالاحتشام حاضرین!

مجلس صداقت اسلام نے فقیر کو اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی فقہی خدمات پر مقالہ تحریر کرنے کے لئے پسند کیا حالانکہ فقیر اس کے لائق نہ تھا لیکن المامور معذور۔ بہر حال کچھ لکھنا پڑا۔ میں آج کے مذاکرہ ذی شان کو

"مذاکرہ رضا"

۶۸ ۱۹ء

سے موسوم کرتا ہوں اس نام سے بحساب جمل، موجودہ سن میلادی ۱۹۶۸ء برآمد ہوتا ہے۔ اور اپنے اس مقالے کے لئے تاریخی نام:

رضا کا مقام فقہ

۸۸ ھ ۱۳

تجویز کرتا ہوں۔ جو موجودہ ہجری سال ۸۸ ۱۳ ہجری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احمد رضاک یا اللہ ٭ واصلی علی مصطفاک ٭ وعلیٰ کل
حامد رضاک ٭ ومن والاک ووالیٰ مرتضاک۔

امام اہل سنت، اعلیٰ حضرت مولانا شاہ محمد احمد رضا خاں صاحب قادری قدس سرہٗ، میرے نزدیک اس صدی کے فقیہ اعظم تھے۔ آپ متداول علوم عربیہ ادبیہ میں ماہر کامل، فنون عقلیہ ونقلیہ میں ایجاد واجتہاد پر فائز تھے۔

آپ کے علم وفضل اور خاصکر علم فقہ میں تبحّر کا اعتراف تو اُن اہل علم نے بھی کیا ہے۔ جنہیں مسلک ومشرب میں آپ سے اختلاف ہے۔ مثلاً ملک غلام علی صاحب جو سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے معاون ہیں اپنے ایک بیان میں جسے ہفت روزہ شہاب لاہور نے ۲۵/ نومبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں درج کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں اب تک ہم لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں ان کی بعض تصانیف اور فتاوے کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ جو علمی گہرائی میں نے ان کے یہاں پائی وہ بہت کم علماء میں پائی جاتی ہے اور عشق خدا ورسول تو ان کی سطر سطر سے پھوٹا پڑتا ہے"

اسی طرح اعظم گڑھ یوپی سے شائع ہونے والا ماہانہ مجلہ "معارف" رقمطراز ہے۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم اپنے وقت کے زبردست عالم، مصنف اور فقیہ تھے انہوں نے چھوٹے بڑے سینکڑوں فقہی مسائل سے

متعلق رسالے لکھے ہیں قرآن عزیز کا سلیس ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ہزارہا فتووں کے جوابات بھی انہوں نے دیئے ہیں۔"

یہ آراء ان لوگوں کی ہیں۔ جن سے مسلکی اختلافات ہیں اور جو مسلک میں متحد ہیں ان کی آراء کا شمار نہیں کیا جا سکتا تاہم چند کلمات علمائے ربانیین و عظماء حرمین طیبین کے اس موقع پر عرض کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔ اب تک تذکرہ ہیں جن جن علماء کے نام پیش کئے گئے ہیں غالباً یہ نام اُن سے جداگانہ ہیں:۔

(۱) شوافع کے مفتی اور امام، نقیب الاشراف اور شیخ السادۃ فی المدینۃ المنورۃ سیدی السید علوی بن السید احمد بافقیہ ارشاد فرماتے ہیں:

"افضل الفضلاء انبل النبلاء فخر السلف قدوۃ الخلف الشیخ احمد رضا"

(۲) احناف کے مفتی و امام السید اسماعیل بن خلیل مدنی فرماتے ہیں:۔

"شیخنا العلامۃ المجرد شیخ الاساتذۃ علی الاطلاق الشیخ احمد رضا۔"

(۳) حنبلیوں کے امام و مفتی اور مسجد نبوی میں مدرس امام عبداللہ النابلسی الحنبلی ارشاد فرماتے ہیں:

"العالم العامل الھمام الفاضل محرر المسائل وعویصات الاحکام ومحکم بروج الادلۃ بمزید اتقان وزیادۃ احکام سید الشیوخ والفضلاء الکرام قاضی القضاۃ الشیخ احمد رضا خان۔"

(۴) مالکی حضرات کے امام و مفتی، مدینہ منورہ میں دارالافتاء کے اعلیٰ نگران

وحاکم سیدی احمد الجزائری ابن السید احمد المدنی ارشاد فرماتے ہیں:

"علامۃ الزمان وفرید الاوان ومنبع العرفان وملحظ النظار سید عدنان حضرت مولینا الشیخ احمد رضاخان"۔

یہ چار شہادتیں مفتیان مذاہب اربعہ احناف، شوافع، حنابلہ، اور مالکیین مدینہ منورہ کی ہیں۔ چاروں مذاہب اربعہ کے مفتیان کرام، علمائے عظام ومدرسین بیت اللہ الحرام مکہ مکرمہ کی پیش خدمت ہیں۔

۱۔ حنفیوں کے امام، ومفتی علامۃ الزمان مولانا سید عبداللہ بن مولینا السید عبدالرحمٰن السراج مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"العلامۃ الفہامۃ الہمام والعمدۃ الدراکۃ الامام ملک العلماء الاعلام الشیخ احمد رضاخان"

۲۔ مالکیین کے امام وقاضی ومفتی مدرس مسجد حرام کے خاص الخاص مفتی حضرت سیدی امام محمد بن علی بن حسین المالکی مفتی ومدرس دیار حرمیہ ارقام فرماتے ہیں:

"ونشرت اعلام الانتصار علی منبر الہدایۃ فی جامع الافتخار وقامت تبث فضائل منشیہا وتنص علی مناہل مصطفیہا وکیف لا وھو احمد المہتدین رضا لازالت شموس تحقیقاتہ المرضیۃ طالعۃ فی سماء الشریعۃ السمحۃ المحمدیۃ"

(۳) مفتی امام محدث علام مدرس بیت الحرام مکہ مکرمہ وامام شافعیہ سیدی محمد صالح، مدرس مسجد حرام وامام شافعیۃ ارقام فرماتے ہیں:۔

فنقول ابقاہ سامیا ذری مجد محد وم العز والسعد

راقاہ عُلل الحبور وار داموار دالسرور ما نزتم بمن جه ماد ح
صدح بشکرہ صادح -

(۴) مکہ مکرمہ میں حنابلہ کے مفتی وامام اور مدرس حضرت علامہ مولٰینا عبداللہ بن حمید مفتی حنابلہ بمکۃ المشرفہ فرماتے ہیں:

"العالم المتحقق المدقق لا زالت شجرۃ علمہ نامیۃ علے ممر الزمان و ثمر عملہ مقبولۃ لدی الملک الدیان الشیخ احمد رضا خاں"

میں نے صرف چار چار دونوں حرم کے علماء کرام کی آراء مختصراً یہاں درج کی ہیں۔

حرمین طیبین کے علاوہ مصروشام، عراق، یمن، الجزائر، نابلس، طرابلس وار دن وغیرہا ممالک عربیہ اسلامیہ کے فضلاء وعلماء کے ایسے ہی خیالات متعدد مرتبہ شائع ہو چکے ہیں!

جب ہم آپ کی تحریرات وفتاوی کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ کہ کیا یہ کام اس تعمق اور اس تیز رفتاری کے ساتھ کسی شخص واحد سے ممکن ہے۔

مثال کے طور پر ۱۳۲۳ھ کا واقعہ ہے، مکہ مکرمہ برائے حج تشریف لے گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ حج پر جانے والا اپنے ساتھ کتب فقہ وحدیث کا ذخیرہ تو نہیں لے جاتا فراغت حج کے ساتھ ہی ایک استفتاء جو پانچ سوالوں پر مشتمل تھا دیا جاتا ہے اور تقاضا یہ ہے کہ دو دن میں جواب مل جائے جس کی مختصر سی کیفیت یہ تھی کہ جو خود مصنف علیہ الرحمۃ نے بیان فرمائی۔

میرے پاس بعض ہندیوں کی طرف سے پیر کے دن عصر کے وقت ۲۵ ذی الحجہ، کو ایک سوال آیا.......... میرے پاس کتابیں نہ تھیں اور مفتی حنفیہ سیدی صالح بن کمال کا کہنا یہ تھا کہ دو دن منگل و بدھ میں

جواب مکمل ہو جائے۔ میں نے رب تبارک و تعالیٰ کی امداد و اعانت پہ

یہ جواب صرف دو جلسوں میں مکمل کیا جس میں سے مجلس اول تقریباً
سات گھنٹے کی تھی اور دوسری مجلس ایک گھنٹے کی' (ترجمہ الدولۃ المکیۃ)
یہ استفتار جو پانچ سوالوں پر مشتمل تھا جس کا جواب دو نشستوں میں جو تقریباً
آٹھ گھنٹے پر حاوی تھیں تحریر کیا گیا۔ یہ عربی زبان میں چار سو صفحات کی کتاب تھی
جسے بنام تاریخی

"الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ"

۱۳ ھ ۲۳

موسوم کیا۔

اس مبارک کتاب میں جبکہ آپ کے پاس کوئی کتاب موجود نہ تھی' متعدد
کتب و فتاویٰ کے حوالہ جات صفحہ وار بتائے ہیں۔ اور محض اپنی یادداشت پہ
بتلائے ہیں۔ یہ محض رب کریم کی وہ عنایت تھی جو وہ اپنے مقبول بندوں کو عطا
فرماتا ہے۔

امام اہل سنت قدس سرہٗ نے اپنی عمر کے آٹھویں سال میں بزبان عربی "ہدایۃ النحو"
کی شرح تحریر فرمائی اور چودہ سال کی' عمر سے مسلسل فقہ پر کام کیا جو اڑسٹھ سال
کی عمر تک جاری رہا یہ بچپن سال کا دور پوری تصانیف پر منقسم کیا جائے تو روزانہ
کی اوسط تحریر ساڑھے تین جز ہوتے ہیں جس کے چھپن صفحات بنتے ہیں۔

فتاویٰ رضویہ کی چار جلدیں (کتاب الطہارۃ سے کتاب الحج تک)
طبع ہو چکی ہیں۔ آٹھ ابھی شائع نہیں ہو سکیں۔ پانچویں چھپ رہی ہے۔ فتاویٰ
دیکھئے تو آپ کو ایک فقیہہ کی فقاہت اور ایک مفتی کی شان افتار کا اندازہ
ہو گا۔

ذرا اس مختصر سے سوال کو دیکھئے فتاوٰی رضویہ جلد اوّل کے صفحہ ۵۸۶ پر ہے
"سوال اول تیمم کی تعریف اور ماہیت شرعیہ کیا ہے؟"
اس کا جواب صفحہ ۵۸۶ سے شروع ہو کر اس جہازی سائز کے صفحہ ۸۷۹ پر ختم ہوتا ہے گویا کہ یہ مسئلہ اس بڑے سائز پر دو سو چورانوے صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

دو چیزیں ہیں ایک تیمم کی تعریف دوسری اس کی ماہیت شرعیہ اس طویل رسالہ کا تاریخی نام:

حسن التعمم لبیان حد التیمم

۱۳ ھ ۲۵

ہے۔ اس میں تیمم کی سات تعریفیں تحریر فرمائی ہیں اور چھٹی تعریف پر تیرہ ابحاث جلیلہ ہیں جو اس کتاب کے سوا، اس انداز میں، کسی دوسری جگہ نظر سے نہیں گذریں۔

اور اسی سلسلہ میں حضرت سیدنا امام زفر رضی اللہ عنہ (جو حضرت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے تلمیذ رشید ہیں) کے ایک قول شریف۔

"کہ خوف کے وقت تیمم جائز ہے" یہ امام زفر کا فرمانا ائمہ ثلاثہ، امام اعظم، امام ابو یوسف، امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے خلاف ہے پر ایک پورے رسالہ میں بحث فرمائی ہے اور پورا رسالہ بزبان عربی تحریر فرمایا۔ جس کا نام الظفر لقول زفر رکھا۔ اور اس بات کی تحقیق کہ قرآن عزیز نے فرمایا فتیمموا صعیداً طیباً ہمارے ائمہ کرام میں سرکار سیدنا امام الائمہ امام اعظم رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ "ہر اس چیز سے تیمم جائز ہے جو جنس ارض سے ہو بشرطیکہ اس میں غیر ارض کا غلبہ نہ پایا جائے۔"

اس کی تحقیق انیق دلائل و براہین سے فرماتے ہوئے ایک رسالہ کامل تحریر فرمایا اور اس کا تاریخی نام:

المطر السعید علی نبت جنس الصعید

۱۳ ھ ۳۵

رکھا۔ اس میں ارشاد فرمایا۔

علمائے کرام نے بیان جنس ارض میں اُن آثار سے کہ اجسام میں نار سے پیدا ہوتے ہیں پانچ لفظ ذکر فرمائے ہیں۔

(۱) احتراق (۲) ترمّد (۳) لین (۴) ذوبان (۵) انطباع۔

اولاً ان کے معانی، اور ان کی باہم نسبتوں کا بیان، پھر کلمات علماء ہیں۔ جن مختلف صورتوں میں ان کا ورود ہوا۔ اُس کا ذکر پھر بیانات پر جو اشکال ہیں اُن کا ایراد، پھر بتوفیقہ تعالیٰ بقدر قدرت تنقیح بالغ و تحقیق بازغ و تبیین مقاصد و دفع ایرادات و تکمیل تحدید و اتاحت افادات کریں۔"

ان کلمات سے آپ اندازہ لگائیں کہ تفقہ کے لئے کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے افتاء اس کا نام نہیں کہ جواب میں جائز ہے۔ یا ناجائز ہے لکھ دیا جائے اور بس بلکہ پوری ذمہ داری محسوس کی جاتی ہے۔ اسی لئے فقہائے کرام نے فقہ و افتاء کا ایک مستقل باب "رسم مفتی" مقرر کیا ہے۔

آپ نے مسلک سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے اثبات اور اپنے نظریات متعلق سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہوئے جو تحقیق انیق فرمائی ہے۔ اُسے بزبان عربی ایک عظیم و جلیل رسالہ میں پیش فرمایا جس کا نام تاریخی:

اجلی الاعلام ان الفتوی مطلقا علی قول الامام

ھ ۱۳ ۳۷

رکھا اور اس رسالہ میں ثابت فرمایا کہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے قول کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے امام کے قول پر کبھی فتویٰ نہ دیا جائے گا اس سلسلہ میں جب بحرالرائق کا یہ قول نظر سے گزرا۔

"ان العمل والفتوی ابدًا بقول الامام الاعظم"

اس پر ایک پورے رسالہ کی طرح پڑی اور یہ رسالہ نادرہ عربی میں ایسا ہے کہ آج کے تمام مفتیان و فقہائے زمن کے لئے بیش بہا خزانہ ہے۔

اس رسالہ میں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"استاذ المحدثین امام اعمش شاگرد امام سیدنا انس رضی اللہ عنہ استاد سیدنا امام اعظم نے امام اعظم سے فرمایا:

"اے گروہِ فقہا، تم طبیب ہو اور محدثین عطار۔ مگر ابو حنیفہ! آپ تو دونوں کناروں پر چھائے ہوئے ہیں۔"

اس پر حضرات فقہائے کرام و مجتہدین عظام کی شہادتیں پیش فرمائیں۔

امام سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

انہ لیکشف لك من العلم من شیئ کلنا عنہ غفلون

"اے ابو حنیفہ آپ پر وہ علوم روشن ہوتے ہیں جن سے ہم سب غافل ہیں۔"

اور انہی امام سفیان ثوری نے فرمایا:

ان الذی یخالف اباحنیفۃ یحتاج الی ان یکون اعلی منہ قدرا و اوفر علما وبعید ما یوجد ذلك۔

امام ابوحنیفہ کی مخالفت کرنے والا امام سے زیادہ علم رکھے تو مخالفت کرسکتا ہے۔ اور ایسا ہونا بعید ہے۔

سیدنا شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

"ما قامت النساء عن رجل اعقل من ابی حنیفۃ"

"دنیا کی عورتوں نے ابو حنیفہ سے زیادہ صاحبِ عقل انسان نہیں جنا"

ان اقوال اور اس کے ماسوا دوسرے ائمہ محدثین و فقہائے معتبرین کے اقوال بیان فرماتے ہوئے سرکار امام اعظم رضی اللہ عنہ کی جلالتِ شان پر وہ نوادر افادات تحریر فرمائے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نہ مل سکیں گے۔

اسی طرح ایک مسئلہ کے بیان میں حضرت سیدنا صدر الشریعۃ شارح وقایہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ضمناً مذکور ہوا کہ حضرت صدر الشریعۃ نے باب التیمم میں فرمایا۔

"الجنب اذا وجد من الماء قدر ما یتوضوء بہ لا غیر

اجزاہ التیمم عندنا"۔

اس پر بعض علمائے معاصرین صدر الشریعہ اور مابعد کے علماء و فقہاء نے کچھ اعتراضات وارد کئے تھے۔

حضرت مجدد اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف توجہ فرمائی۔ اور کلام صدر الشریعہ کی تشریح فرماتے ہوئے ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا تاریخی نام

الطلبۃ البدیعۃ فی قول صدر الشریعۃ

۱۳ ھ ۳۵

رکھا۔ اس رسالہ میں تمام شبہات و اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی توجیہ فرمائی۔

بات در اصل یہ ہے کہ فاضل بریلوی کا مسلک یہ ہے کہ اساطین اسلام فقہائے کرام و علمائے عظام انبیاء و مرسلین اولیاء و صالحین صحابہ و اہل بیت اطہار سب ہماری آنکھوں کے نور ہیں سب کی تعظیم و توقیر ہم پر

لازم ہے۔

فرق مراتب ضروری ہے لیکن کسی کی کوئی فضیلت بیان کرتے ہوئے دوسرے کی شان کی ادنیٰ سے ادنیٰ تخفیف ناقابل برداشت ہے۔

مفتی اگر غائر النظر فقیہ ہو تو لازمی طور پر وہ کسی استفتاء کا جواب تحریر کرتے ہوئے آیات قرآنیہ، احادیث، اقوال فقہاء و علماء مشاہیر سے اپنے جواب کو مدلل اور مفصل کر کے لکھے گا۔ البتہ جو شخص سہل انگاری یا ایک طرح کے پندار میں گرفتار ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میری ہر غلط و صحیح رطب و یابس کو قوم مان لیگی وہ بے دلیل جواب لکھا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ حضرت کے ایک معاصر صاحب فتویٰ سے پوچھا گیا:۔

"مسجد کی دیوار سے تیمم جائز ہے یا نہیں"

انہوں نے مطبوعہ فتاویٰ میں جواب شائع کیا:

"تیمم دیوار مسجد سے کرنے کو بعض کتب فقہ میں مکروہ لکھا ہے" فقط

یہی سوال حضرت فقیہ اعظم بریلوی سے ہوا اور مجیب اول کا یہ جواب بھی سامنے آیا یہ جواب اس کے فتاوے میں چھپ چکا تھا، جواب کے لئے قلم اٹھا اور بطور تمہید ارشاد فرمایا:

"تحریر مذکور صواب سے بیگانہ،....... مذہب حنفی میں اس کی کچھ اصل نہیں، نہ کسی کتاب معتمد سے اس کی کراہت مبین، نہ ایسی نقل مجہول، کسی طرح قابل قبول..... بلکہ کتب معتمدہ سے اس کا بطلان روشن جن سے گر نہ بینی بہ رد ز پردہ بر افگن"

اس مختصر تمہید کے بعد جواب تحریر فرمایا

نیز معتمد کتب وفتاوی سے مسئلہ کو واضح فرماتے ہوئے مجیب کے لفظ "بعض کتب فقہ میں مکروہ لکھا ہے" اس کے متعلق

تحریر فرمایا کہ مجیب کو شاید یہ شبہ ہوا کہ دیوار مسجد وقف ہے اور وقف پر تصرف ناجائز کہ مسجد کی دیوار جس غرض کے لئے بنائی گئی اس میں تیمم داخل نہیں۔ لہذا دیوار مسجد سے تیمم مکروہ۔

ارشاد فرمایا:۔

یہ دیوار میں کوئی تصرف نہ کہلائے گا ورنہ مکروہ نہیں حرام ہوتا نہ صرف دیوار مسجد بلکہ دیوار ہر وقف بلکہ دیوار یتیم بلکہ ہر نابالغ بلکہ بے اذنِ مالک، ہر دیوار مملوک سے تیمم کرنا بلکہ اس پر ہاتھ لگانا یا انگلی سے چھونا یا دیوار مسجد سے پیٹھ لگانا سب حرام ہوتا اور اس کا قائل نہ ہوگا مگر سخت جاہل"۔

جمع بین الصلوٰتین ایک معرکۃ الآراء مسئلہ تھا اور مختلف مکاتیب فکر کے اصحاب الرائے کا اپنا اپنا انداز تحریر جداگانہ تھا اور اصل مسئلہ کئی سو برس سے الجھا ہوا تھا کہ حضرت فقیہہ اعظم کو اس طرف توجہ ہوئی اور مبسوط دواضح کتاب تالیف فرما کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اختلاف کو مٹا کر اس مسئلہ کو ثابت و واضح فرمادیا۔

اور ثبوت مقصد کے لئے اجمال کلام و دلائل مذہب کو صرف چار فصلوں میں منقسم فرمایا اور ارشاد فرمایا:

...... میاں صاحب دہلوی...... نے...... جیسا کلام حنفیہ کے خلاف جہاں کہیں ملا سب جمع کر لیا، اور کھلے خزانے، احادیث صحاح کو رد فرمائے، رواۃ صحیحین کو مردود بتلانے، بخاری و

مسلم کی صدہا حدیثوں کو واہیات بتلانے سے اپنی نئی ابکار افکار کو جلوہ دیا تو بعون قدیر اُس تحریر..... کے رد میں تمام مساعی نود کہن کا جواب اور ملاجی کے ادعائے باطل عمل بالحدیث ولیاقت واجتہاد علم حدیث کے روئے بنائی سے کشف حجاب بعض علمائے عصر وعظمائے وقت (یعنی جناب مستطاب عالم علوم شرعیہ ماہر فنون عقلیہ ونقلیہ....... حضرت مولانا حافظ شاہ ارشاد حسین صاحب فاروقی مجددی رامپوری رحمۃ اللہ علیہ) غفر اللہ تعالیٰ لنا ولہ...... نے ملاجی پر تعقبات کثیرہ بسیط کئے مگر انشاء اللہ الکریم..... یہ افاضات تازہ چیزے دیگر ہوں گے۔ جنہیں دیکھ کر ہر منصف حق پسند بے ساختہ پکار اٹھے کہ

کم ترک الاول للاٰخر"

یہ کتاب بے نظیر مطالعہ کے لائق اور فقہ حنفی کے لٹریچر میں ایک معرکۃ الآراء اضافہ ہے۔ لسے آیات قرآنیہ واحادیث شریعہ اور ائمۂ سلف کے اقوال مرضیہ سے ایسا مدلل فرمایا کہ اس کی مثال نظر نہ آسکے۔ یہ کتاب ۲۰×۲۶/۸ کے سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۳۱۳ھ ہجری ماہ رجب المرجب میں تحریر فرمائی اور بلحاظ تاریخ

حاجز البحرین الواقی عن جمع الصلوتین

۱۳ ۱۳ھ

نام رکھا۔

اسی طرح جب مدعیان تصوف ومشیخت نے دام تزویر ہم رنگ زمین بچھا کر مردمان خدا وامت رسول جل وعلی وصلی اللہ علیہ وسلم کو جادۂ اعتدال

سے ہٹائیے اور اپنی ناپاک ذوات کو سجدہ کرنے کے لئے فاسد خیالات کا ادعا کیا تو قلم حقیقت رقم جو ہمہ وقت جہاد با لقلم کے لئے تیار رہتا تھا اور مجدد اعظم بریلوی نے کہ آپ کا یہی طرز و وطیرہ تھا کہ ہر باطل و فاسد آواز کو پوری قوت سے دبایا جائے اور سرور کائنات علیہ التحیۃ والتسلیمات کے ارشاد عالی من رای منکم منکرا فلیغیرہٗ بیدہٖ الحدیث پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حتی الوسع منکرات وبدعات کا استیصال کیا جائے اس طرف توجہ فرمائی اور ایک کتاب تالیف فرمائی۔ جس میں دس آیات قرآنی اور چالیس احادیث حقانی اور ایک سو تیس اقوال علمائے ربانی سے ثابت فرمایا کہ رب العزت جل جلالہ کے سوا کسی ذی روح، جاندار، غیر ذی روح، جماد، درخت، پتھر، قبر، ومرقد شیخ ومرشد زندہ ومردہ کو سجدہ حرام حرام حرام ہے بہ نیت عبادت شرک خالص۔ اور بہ نیت تعظیم وتوقیر حرام۔ اور پوری ذمہ داری سے بہ واضح فرمادیا کہ سجدۂ تعظیمی شریعت مطہرہ مقدسہ طیبہ طاہرہ میں رب تعالیٰ کے سوا کسی کو کسی بھی نیت سے جائز نہیں حرام ہے۔ اور ایسی لاجواب کتاب لکھی کہ آج اکیاون برس سے چھپی ہوئی مل رہی ہے کسی نام نہاد پیر وصوفی کو اپنے ادعائے باطل کے اثبات کے لئے اس کتاب کا جواب میسر نہ آیا۔ اور بحمدہٖ تعالیٰ قیامت تک نہ ہو سکے گا۔ مذہب اہلسنت یہی ہے سجدۂ تعظیمی کی حرمت بدلائل واضحہ پر یہ کتاب بے نظیر وبے مثال ہے۔ اور بلحاظ تاریخ اس کا نام ـــــ الزبدۃ الزکیۃ فی تحریم سجود التحیۃ ــ ہے۔

۱۳ ھ ۳۷

الغرض جس طرف قلم حقیقت رقم اٹھ گیا علم کے دریا بہادیئے اور آیات واحادیث اور اقوال فقہا ومجتہدین سے مسئلہ کی وضاحت ایسی فرمادی کہ گنجائش کلام

نہ رہی۔ اس طرح کی مبسوط و مفصل مختصر و موجز کتب و رسائل مطبوع و غیر مطبوع ہزار سے متجاوز ہیں۔

فتاویٰ رضویہ اس کے ماسوا بارہ طویل مجلدات پر مشتمل ایک ایسی جامع کتاب ہے کہ جس کے پاس ہو اسے کسی بھی کتاب کی ضرورت نہ رہے۔

جلد اوّل کہ بظاہر طہارت میں باب التیمم تک ہے اور صرف ایک سو چودہ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اس میں علاوہ طہارت و تیمم کے، دیگر کثیر ابواب نفقیہہ کے صدہا مسائل کی تحقیق بھی ضمنی طور پر آگئی ہے۔

اپنے رسالہ "قوانین العلما" میں حضرات فقہائے کرام۔ مثلاً حضرت علامہ شامی۔ علامہ بحر العلوم، علامہ امام صدر الشریعہ وغیرہم کے قوانین پر کلام فرمایا جس میں سے الجوھرۃ النیرہ پر پانچ وجوہ سے اور قانون امام صدر الشریعۃ پر تین۳ وجوہ سے اور قانون البحر الرائق پر گیارہ۱۱ وجوہ سے اور قانون علامہ حلبی پر نو۹ وجوہ سے کلام فرماتے ہوئے القانون الرضوی کی چارسو چھبیس۴۲۶ اقسام کو دس۱۰ میں جمع فرمادیا اور اُنّیس۱۹ نئے قواعد ایجاد فرمائے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن کے دیکھنے سے اس فقیہہ اعظم کی گہرائی نظر و وسعت معلومات و مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

فقیر یہاں پر، اعلیٰ حضرت کی اہم دو سندیں درج کرتا ہے۔ ایک سند حدیث، اور دوسری سندِ فقہ۔ سندِ حدیث گیارہ واسطوں سے امام بخاری تک، اور سندِ فقہ تیئیس واسطوں سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہے۔ سندِ حدیث یوں ہے۔

(۱) اعلیٰ حضرت عظیم البرکت اجازت یافتہ ہیں مولانا صالح جمل اللیل امام شافعیہ و شیخ الخطباء سے۔ اور وہ اجازت یافتہ ہیں۔

(۲) حضرت شیخ جلیل مولانا عابد السندی الانصاری مدنی سے۔ وہ
(۳) امام محمد صالح العمری المدنی سے۔ وہ
(۴) امام معمر محمد سنہ العمری سے، وہ
(۵) شیخ ابو الوفاء احمد بن عجلی یمنی سے۔ وہ
(۶) شیخ قطب الدین محمد بن احمد مفتی مکہ مکرمہ سے۔ وہ (۷) شیخ ابو الفتوح احمد بن عبد اللہ بن ابی الفتوح سے۔ وہ اپنے شیخ معمر (معروف بہ شیخ سہ صد سالہ) ابو یوسف الہروی سے۔ وہ اپنے شیخ المعمر محمد بن شاد بخت فارسی فرغانی سے۔ وہ اپنے استاد شیخ ابدال سمرقندی سے۔ وہ ابو عثمان یحیٰی بن عمار بن مقبل بن شاہان ختلانی سے۔ وہ اپنے استاد شیخ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف فربری سے۔ وہ امیر المومنین فی الحدیث حجۃ المحدثین امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ وعلیہم اجمعین سے

اور سند فقہ حنفی یوں ہے مولانا احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ حضرت عبد الرحمٰن سراج مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ۔ (۲) حضرت مفتی اعظم احناف جمال بن عبد اللہ بن عمر (۳) حضرت امام اجل عابد سندی انصاری۔ (۴) شیخ یوسف بن محمد (۵) شیخ عبد القادر بن خلیل۔ (۶) شیخ اسماعیل بن عبد اللہ (علی زادہ) (۷) شیخ عارف باللہ عبد الغنی نابلسی (۸) شیخ العلامہ حسن شرنبلالی (۹) حضرت شیخ محمد بن احمد حموی۔ (۱۰) شیخ احمد بن یونس شلبی (۱۱) شیخ سری الدین عبد البر (۱۲) حضرت امام کمال بن ہمام (۱۳) شیخ علاء الدین سیرانی (۱۴) شیخ جلال الدین خبازی (۱۵) شیخ عبد العزیز بخاری۔ (۱۶) جلال الدین شیخ امام عبد الستار بن محمد کردی۔ (۱۷) امام برہان الشریعہ برہان الدین۔ (۱۸) امام فخر الاسلام (۱۹) شمس الائمہ الحلوائی (۲۰) قاضی ابو علی نسفی۔ (۲۱) ابو بکر محمد بن

فضل البخاری۔ (۲۲) امام ابو عبد اللہ سبذ مونی۔ (۲۳) عبد اللہ بن ابی حفص البخاری (۲۴) امام ابو عبد اللہ محمد بن حسن شیبانی۔ الامام الاعظم ابو حنیفہ نعمان ابن ثابت رضی اللہ عنہ وارضاہ عنا وعنہم۔

سترہ اسانید امام اہلسنت مجدد اعظم بریلوی رضی اللہ عنہ میں سے یہ دو سندیں یہاں ذکر کی گئی ہیں۔

اسانید امام اہل سنت رضی اللہ عنہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہوں تو فتاویٰ رضویہ جلد اول، سرور العید السعید، ازھار الانوار اور الاجازات المتینہ ملاحظہ کریں۔[1]

فقیہ اعظم بریلوی کے فضل کا اندازہ لگانا ہو تو مفتی اعظم سی۔ پی و برار کا مقالہ شریفہ دیکھیں۔

فقیر بھی اس سے ایک حوالہ جسے حضرت والا نے الاجازات المتینہ سے نقل فرمایا ہے پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہے۔

"اعلیٰ حضرت مجدد مائۃ حاضرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک فتویٰ علامہ جلیل حضرت مولانا سید اسماعیل خلیل حافظ کتب حرم مکہ مکرمہ نے دیکھا بے انتہا حیرت و استعجاب و مسرت کے ساتھ حضرت مجدد اعظم علیہ الرحمۃ کی خدمت میں تحریر روانہ فرمائی جس میں حمد و صلاۃ کے بعد اعلیٰ حضرت کو مخاطب فرماتے ہیں:

شیخ الاسلام بلا مرافع وحید العصر بلا منازع۔ اور چند سطور کے بعد فرماتے ہیں و واللہ اقول والحق اقول انہ لورآھا

---

[1] عنقریب فقیر غفرلہ الولی القدیر اسناد المختار کے نام سے ان تمام اسانید کو شائع کرنے والا ہے۔

ابوحنیفۃ النعمان لاقرت عینہ ولجعل مؤلفہا من جملۃ الاصحاب یعنی اور اللہ کی قسم کہہ کر کہتا ہوں اور بالکل حق کہتا ہوں کہ بے شک اس فتوے کو اگر امام اعظم ابوحنیفہ نعمان رضی اللہ عنہ دیکھتے تو بلاشبہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور یقیناً اس فتوے کے مولف کو امام اعظم اپنے اصحاب (امام ابویوسف امام محمد امام زفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم) میں شامل فرماتے ـــــ"

(مجدد اسلام صفحہ ۱۸۱)

افریقہ اور جنوبی امریکہ وغیرہا ممالک بعیدہ سے انگریزی میں سوالات آئے اُن کے جواب انگریزی میں دیئے گئے عربی فارسی تو روزمرہ کی گفتگو میں شامل تھی عربی ایسی سلیس اور عمدہ ہوتی تھی جب آپ کی کتاب الدولۃ المکیۃ شریف مکہ مکرمہ کے ایک سو بیس سالہ شیخ الخطباء شیخ الادباء شیخ العلماء مولانا ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نے ملاحظہ فرمائی تو بے ساختہ فرمایا کہ:۔

"کتاب پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی عربی النسل کی لکھی ہوئی ہے۔ میں نے غور سے پڑھی کہیں ایک بھی نقطہ لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔"

فقیہ اعظم کا ایک عظیم وجلیل حاشیہ جو چار مجلدات پر مشتمل ہے وہ حاشیہ امام ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوے "رد المحتار" پر ہے جسے آپ نے بنام "جد الممتار" موسوم فرمایا ہے۔ لیکن یہ بیش قیمت حاشیہ اسی ذخیرے میں پڑا ہے، جو ابھی تک محروم اشاعت ہے۔

مولیٰ تعالیٰ کسی ایسے مرد جلیل کو پیدا فرمادے جو تصانیف مجدد اعظم رضی اللہ عنہ کے لئے "مرکز اشاعت علوم امام احمد رضا" قائم کرے اور

آپ کے جواہر علمی کو جلوہ طباعت دے۔ آمین۔

اعلیٰ حضرت میں جہاں لاکھوں دوسری خوبیاں تھیں یہ خوبی بھی حد کمال تک تھی کہ آپ نے اپنے بیشتر رسائل و کتب کے نام تاریخی اعتبار سے لکھے اور دوسری خوبی یہ رکھی کہ صرف رسالہ کا نام دیکھ کر انسان کو معلوم ہو جائے کہ یہ رسالہ کس مقصد میں ہے فقہی مسئلہ میں مصنف کا کیا نظریہ ہے۔

آپ سے پہلے کے بعض اجلّہ علمائے اہلِ سُنّت کے یہاں بھی یہ بات تھی کہ وہ اپنے مقاصد کو جب صفحۂ قرطاس پر لاتے تو اعداد جمل کے اعتبار سے اُس کا ایسا نام تجویز فرماتے جو سنہ تالیف تو بتادے۔ لیکن دوسری بات اس سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کتاب کس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اور اس میں مُصنّف کا نظریہ کیا ہے متقدمین میں بالالتزام نہیں ملتی۔ اعلیٰ حضرت نے تو اس کا التزام رکھا ہے کہ نامِ کتاب، مقصد و رجحانِ طبع، مسلک و نظریہ کا اظہار ہو جائے، تاکہ جس مقصد کے لئے کتاب درکار ہو ناظر اُسے آسانی سے حاصل کر سکے۔

مثال کے طور پر مسئلہ یہ پیش ہوا کہ آیا سادات کرام اہلِ بیت عظام کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے یا نہیں:۔

اس میں مذہب امام اعظم رحمۃ اللہ یہ ہے کہ سادات کرام پر مال زکوٰۃ حرام ہے[1]۔

---

[1] یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے۔ کہ بنو ہاشم (سادات) کے لئے صدقات کے مسئلے میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے دوسرا قول، امام طحاوی نے جواز کا نقل کیا ہے۔ امام صاحب دلیل یہ دیتے ہیں۔ کہ عہد نبوی میں، بنو ہاشم کے لئے اموالِ غنیمت میں سے ایک حصہ مقرر تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

اہلِ بیت اطہار وہ پاکیزہ نفوس ہیں جنہیں سرکار ابد قرار سید عالم باعث ایجاد عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے اور ان میں حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت کی وجہ سے وہ خوبی پیدا ہو چکی ہے کہ زکوٰۃ جیسے لوگوں کا میل کہا گیا ہے ان نفوس قدسیہ پر خود سرکار احمد مختار صلے اللہ علیہ وسلم نے حرام فرما دیا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے اس مسئلہ کی وضاحت فرماتے ہوئے جو رسالہ تصنیف فرمایا ہے اُس کا نام ہے۔

الزهر الباسم فی حرمة الزکوٰة علی بنی هاشم

۱۳ ھ ۲

یعنی کلیاں مسکراتی ہیں اس بات پر کہ اولادِ ہاشم پر زکوٰۃ حرام ہے۔
اب آپ اندازہ لگائیں کہ نام میں کیا کیا خوبیاں رکھی گئی ہیں۔

(حاشیہ گذشتہ صفحہ کا بقیہ) اس لئے زکوٰۃ وصدقات سے انہیں محروم کر دیا گیا۔ عہد نبوی کے بعد جب ایسے حالات پیدا ہو گئے، کہ بنو ہاشم کا حصۂ غنیمت موقوف ہو گیا۔ تو باعثِ حرمت اٹھ جانے کی وجہ سے، ان کے لئے یہ حُرمت ختم ہو گئی۔ یعنی بنو ہاشم اگر حاجتمند ہوں، تو موجودہ حالات میں، ان پر زکوٰۃ صرف کرنا جائز ہے۔ امام ابو جعفر طحاوی (وفات ۳۲۱ھ) نے ہر دو اقوال اپنی کتاب، "شرح معانی الآثار" (مطبع مصطفائی) کے صفحہ ۱۰۳ پر درج کئے ہیں۔ (کوکب)

یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ، اس فقیہِ اعظم کی شانِ تفقّہ کو کما حقّہ، خراجِ عقیدت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ دعا ہے۔ کہ حضرت کا سرمایۂ فقہی، جلد منظرِ عام پر لائے جانے کی کوئی صورت پیدا ہو۔

انہی الفاظ پر فقیر اپنے اس مقالہ کو ختم کر رہا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ شرفِ قبول عطا فرمائے۔

فقیر قادری محمد اعجاز الرضوی عفی عنہٗ

مغزِ قرآں
جانِ ایماں
رُوحِ دیں
ہست حُبِّ
رحمۃٌ للعٰلمینؐ
(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حُبِّ پیغمبر کی دنیائے جمیل

یہ گفتگو برِّ عظیم کے ایک بلند پایہ دینی رہنما مولانا احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے متعلق ہے۔ چونکہ اس شخصیت کا ممتاز عنصر حُبِّ رسُول ہے۔ اس لئے اس گفتگو کے دامن میں، میں یہ بتانا چاہتا ہوں، کہ پیغمبرِ اسلام صلّے اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ والہانہ وابستگی سے، انسانی شخصیت پر کیا اثرات طاری ہوتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے، اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت ہمارے دین میں کیا اہمیت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف: "الشفاء بتعریف حقوق المصطفٰے[۱]" ایک منفرد حیثیت رکھنے والی کتاب ہے۔ اس کتاب کی شرح بڑے بڑے اساطینِ علم نے تحریر کیں۔ جن میں ایک گراں قدر شرح، مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

"الشفاء" میں ایک مقام پر، قاضی عیاض فرماتے ہیں:۔

الباب الثانی فی لزوم محبّتہ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

دوسرا باب اس مسئلے سے متعلق ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت لازم ہے۔

اس عنوان کی شرح کرتے ہوئے، مُلّا علی قاری تحریر فرماتے ہیں:۔

ای فی ذکر ما یؤذن بوجوب لزوم محبّته لکلّ مکلّف من
اُمته فی لوازم ملّته

یعنی اِس باب میں، اِن امور کا تذکرہ مقصود ہے، جن سے ثابت ہوتا
ہے۔ کہ اُمتِ محمدیہ کے ہر مکلّف فرد پر، اپنے پیغمبر کی محبت لازم و واجب
ہے۔ جو فرائضِ ملّی میں داخل ہے۔

اس حقیقت کے قرآنی ثبوت کے لیے قاضی عیاض، یہ آیۃ کریمہ پیش کرتے ہیں:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ
وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ﰳاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ
وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ع (التوبة : ۲۴)۔

آپ ان سے فرما دیجیے: اگر تمہیں، تمہارے آبا و اجداد، بیٹے پوتے، بہن بھائی،
قرابتدار، جمع کردہ سرمایہ، کاروبار جن کے خسارے کا تمہیں اندیشہ رہتا
ہو، اور تمہاری دل پسند رہائش گاہیں، اللہ، اس کے رسول اور راہِ خدا
میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں۔ تو پھر خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ بہر حال
اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

اس آیت سے، قاضی عیاض اور مُلّا علی قاری کا یہ استدلال بالکل واضح ہے۔
جسے تمام علمائے امت کی تائید حاصل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ، رسول
اللہ ﷺ کی محبت، کو بھی بندۂ مومن کے دل میں، یہ مقام حاصل ہونا لازمِ ایمان ہے
کہ دنیا کی کسی دوسری چیز، یا کسی دوسرے رشتہ و تعلق کی محبت، اس محبت پر

غالب نہ آسکے۔

اس کے بعد، فاضل مؤلف نے صحاحِ ستہ کی یہ مشہور اور صحیح حدیث درج کی ہے:۔

عن أنسٍ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایؤمن أحدکم حتی أکونَ احب الیہ من ولدہٖ ووالدہٖ والناس اجمعین۔

حضرت انس سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں اس کے نزدیک، اس کی اولاد سے، اس کے والد سے، اور دنیا بھر کے لوگوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔"

سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اپنی ذات سے محبت اور اپنی اولاد سے محبت، انسان کی طبیعت میں گہرا رسوخ رکھتی ہیں۔ اور یہ بات فطری ہے، کہ عموماً یہ محبتیں، دوسری محبتوں پر غالب ہوتی ہیں۔ تو کیا دینِ خداوندی، ایک خلافِ فطرت بات کا حکم دے رہا ہے۔ اس کا جواب، مُلّا علی قاری نے حسبِ ذیل الفاظ میں دیا ہے۔

واعلم ان المراد بالحبّ ھُنا، لیس الحُبّ الطبیعی التابع لھوی النفس، فان محبة الانسان لنفسہ من حیث الطبع اشدُّ من محبة غیرھما وھذا الحبُّ لیس بداخل تحت اختیار الشخص، بل خارج عن حدِّ الاستطاعة فلا مؤاخذة بہ لقولہ تعالیٰ: "لایکلف اللہ نفساً اِلّا وسعھا"

بل المراد الحب العقلی الاختیاری الذی ھو ایثارُ

مایقتضی العقل رجحانہ وان کان علیٰ خلاف الطبع.....
.... المومن اذا علم ان الرّسول علیہ الصلوٰۃ
والسلام لا یأمر ولا ینھیٰ الا بما فیہ صلاح دینہ و
دنیاہ و آخرتہ وعقباہ وتیقّن انہٗ علیہ الصلوٰۃ والسلام
اشفق الناس علیہ وألطفھم علیہ وحینئذٍ یرجح
جانب امرہ بمقتضیٰ عقلہ علیٰ امر غیرہ وھٰذا اوّلُ
درجت الایمان، واما کمالہ فھو ان یّصیر طبعہ تابعاً
لعقلہ فی حُبّہ علیہ الصلوٰۃ والسلام،

قیل وحبتہٗ نصر سُنّتہ والذبّ عن شریعتہ
والاقتداء بسیرتہ۔

(مُلا علی قاری: شرح الشفاء ج ۳ ص ۳۴۳ ــــ ۳۴۵)

(جان لیجئے! کہ محبت سے، یہاں وہ طبعی محبت مراد نہیں، جو ذاتی خواہشات کے ماتحت ہوتی ہے۔ کیونکہ طبعی اعتبار سے انسان کے لئے، اپنی ذات کی محبت، دوسری کسی محبت سے، قوی تر ہے۔ اسی طرح اولاد اور والدین کی محبت بھی، دوسری محبتوں سے شدید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محبت (طبعی) انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ یہ تو حدِ استطاعت سے خارج ہے۔ لہٰذا اس پر مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "کسی جان پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی"۔

بلکہ یہاں وہ عقلی اور اختیاری محبت مراد ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ عقلِ سلیم جس چیز کی طرف رجحان رکھنے کا تقاضا کرتی ہو،

اُسے پسند کر لیا جائے اور اپنا لیا جائے، خواہ وہ چیز طبیعت کے خلاف ہی ہو۔........... بندۂ مومن جب یہ جانتا ہے کہ رسول کی طرف سے ہر حکم اور ہر ممانعت، یقیناً اُس کے دین و دُنیا، اور اس کے معاش و معاد کی بھلائی پر مبنی ہے۔ اور اس کا یہ علم، یقینِ کامل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کہ واقعی خدا کا رسول ہی اس پر سب سے بڑھ کر مہربان اور سب سے بڑھ کر لطف و کرم فرمانے والا ہے، تو اس کی عقل یہ فیصلہ دیتی ہے، کہ رسول ہی کے حکم کو دوسرے ہر کسی کے حکم پر ترجیح ملنی ضروری ہے ـــ (یہ فیصلہ انسان کے اختیار میں ہے۔ اور یہی بنیاد ہے تعلق بالرسول اور حُبِّ رسول کی) یہ مقام، ایمان کا ابتدائی درجہ ہے۔ لیکن کمالِ ایمانی اس میں ہے، کہ رسول کی محبت، انسان کے لیے طبیعی محبت بن جائے۔ یعنی طبیعت بھی اس فیصلے کی تابع ہو جائے، جو فیصلہ مومن نے عقل و اختیار سے کیا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت یہ ہے، کہ سُنّت کی خدمت کے لیے، شریعت کی محافظت کے لیے اور سیرتِ طیبہ کی اقتدار کے لیے زندگی وقف کر دی جائے"۔؎

اُوپر کے اقتباس سے تین بنیادی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱ـــ محبتِ رسول، ایمان کے لئے لازمی بنیاد ہے۔ مگر شریعت نے انسان پر طبیعی محبت کی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ کیونکہ وہ انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ بلکہ وہ محبت کافی ہے، جو عقل و شعور اور اختیار و ارادہ کی دُنیا سے تعلق رکھتی ہے۔

۲ـــ جب محبتِ رسول، عقل و شعور کی دُنیا سے آگے بڑھ کر جذبہ

وطبیعت کی اقلیم پر بھی حکمراں ہو جائے۔ تو کمالِ ایمانی کے درجاتِ عالیہ کا دروازہ بندۂ مومن پر کھل جاتا ہے۔

۳— محبتِ نبوی کے لازمی تقاضے اور اثرات یہ ہیں۔ کہ زندگی میں ان تمام چیزوں کے لئے زبردست علاقہ ونسبت پیدا ہو جائے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت رکھتی ہیں۔ یہ حُبِّ رسول ہی کے کرشمے ہیں۔ کہ اس اُمّت کی تاریخ کے ہر دور میں، ہزاروں افراد ایسے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی زندگیاں، سُنّت وسیرت کے سدا بہار گلشن بن کر مسکراتی ہیں۔

یہاں پہنچ کر، میں اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جو سرِ آغاز پر کہی گئی تھی۔ کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ وابستگی سے، انسانی شخصیت پر کیا اثرات طاری ہوتے ہیں۔ دراصل یہ وابستگی انفرادی اور اجتماعی دونوں رُخوں سے ہمارے لئے مرکزِ حیات ہے۔

ے
در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

اور ے

تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

مگر اس مضمون میں، ہمارا موضوع، انفرادی شخصیت کے گرد گھومتا ہے۔ یعنی فرد کی زندگی میں، وابستگیٔ رسول سے کیا وزن پیدا ہوتا ہے۔ اس مطالعے کے لئے مولانا احمد رضا کی شخصیت کو ایک موزوں منظر کے طور پر سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم مسئلے کی تفہیم کو، اپنی موجودہ نسل کے لئے اور زیادہ روشن کرنا پسند کریں، تو اس مطالعے میں علامہ اقبال کو بھی شامل کر لینا چاہئے۔

یہ دونوں شخص، بے شک دینی ماحول میں پیدا ہوئے — مگر دونوں عبقری (GENIUS) تھے، نہایت اخاذ و وقاد، از حد تیز ذہن اور پر قوت جذبات و حسیات کے مالک — اگر عشقِ رسول کا دامن، ان کے ہاتھ میں نہ آتا، تو اپنے ہی پیچ و تاب کی آندھیوں سے اُڑ جاتے، یا کہیں انحراف کی جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جاتے،

اقبال کو اقبال کس نے بنایا؟ وہ کس کے عشق کا فیض عام ہے؟ اقبال جانتا ہے۔ اور اعتراف کرتا ہے۔ احمد رضا بھی اگر رشکِ قمر ہے۔ تو اسی آفتاب عالمتاب سے ایک ذرّے کی سی نسبت رکھنے پر ایسا ہے ؎

رشکِ قمر ہوں، رنگِ رُخِ آفتاب ہوں
ذرہ ترا جو اے شہِ گردوں جناب ہوں
حسرت میں خاک بوسیِ طیبہ کی اے رضا
ٹپکا جو چشمِ مہر سے وہ خونِ ناب ہوں

عبقریت میں عدم توازن (ABNORMALITY) کا پایا جانا، اب مسلم ہو چکا ہے۔ مگر عبقری شخصیت کی صلاحیتیں اور قوتیں بہر حال غیر معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کا خاکہ تو عام متداول ہے۔ اس کے عدم توازنات اور اس کی پر زور قوتوں کا خود مشاہدہ کرنے والے ابھی بیسیوں افراد زندہ ہیں۔ مگر مولانا احمد رضا کی شخصیت بھی میرے نزدیک، اس سے مختلف نہ تھی۔ انکی فوق المعمول صلاحیتوں کا اندازہ ان اُمور سے ہو سکتا ہے۔ کہ ۸ برس کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا۔ چھ برس کے تھے، کہ ولادتِ نبوی کے موضوع پر تقریر کی۔ تیرہ برس دس ماہ کے ہوئے، تو دینیات کے مکمل نصاب اور دورۂ حدیث سے فارغ ہو گئے۔ فراغت کے دن پر ہی، ایک استفتار کا جواب تحریر کر دیا۔ والد ماجد نے دیکھا، تو بالکل صحیح فتویٰ تھا۔ اسی دن سے فتویٰ نویسی

سپرد کردی گئی۔ تعلّم کے دور میں، کتاب کا بمشکل چوتھائی حصّہ استاد سے پڑھتے۔ باقی کتاب از خود چند دنوں میں محفوظ کر کے استاد کو سنا دیتے۔ ایک موقع پر آپ کے استاد محترم نے کہہ دیا تھا: " احمد میاں تم آدمی ہو کہ جنّ ، مجھے پڑھانے میں دیر لگتی ہے، مگر تمہیں یاد کرنے میں دیر نہیں لگتی "۔ پھر یہ حقیقت کہ پچاس مختلف علوم و فنون شرعیہ و عقلیہ پر ایک ہزار کے قریب تالیفات مرتب کرنا۔ ادھر فقہ و تفسیر و حدیث میں کامل تبحّر اور اُدھر علوم ریاضیہ میں حیرت انگیز تعمّق — عبارات کے حوالے، سینکڑوں کتابوں سے، بقیدِ صفحہ و سطور زبانی محفوظ — یہ سب چیزیں عبقریت کی پوری نشاندھی کرتی ہیں۔

باقی رہا سوال (Abnormality) کا۔ تو اس کے نمایاں اثرات مولانا کی زندگی میں اس لئے درج نہ ہو سکے۔ کہ زیر بحث مُربّی قوت (وابستگی رسالت) نے اس زندگی کو بہت ابتدائی عمر ہی سے، آغوش میں لے لیا تھا۔ تاہم چند ایک، واقعات سے، ابنارملیٹی کا سراغ پکڑا جا سکتا ہے۔ مثلاً اوائلِ عمر میں، ایک دفعہ رات کے گیارہ بجے بریلی کے مجذوب فقیر بشیر الدین کے پاس تنہا چلے جانا۔ اسی طرح وہ واقعہ بھی اس پہلو پر دلالت کرتا ہے۔ جب ایک دفعہ آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے۔ کہ ایک روز افطار کے بعد کافی دیر تک گھر سے پان نہ پہنچے۔ جب دو گھنٹہ کے بعد خادم بچہ، پان لے کر آیا تو آپ نے اسے چپت مار دیا۔ اور کہا کہ اتنی دیر میں لایا۔ (واقعہ کا باقی حصّہ آگے آتا ہے)۔

اس مطالعے سے یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ عبقری صلاحیتوں کے لوگ نبوّت سے وابستگی استوار کر کے ہی، کسی ملک و ملّت یا معاشرے کے لئے موجب افادیت ہو سکتے ہیں۔ تعلّق بالرسول کا لنگر نہ ہو، تو عبقریت کا سفینہ، اپنی تند و تیز اور ادر غیر متوازن قوتوں کے تھپیڑوں پر مسلسل رقصِ آوارہ کرتا رہتا ہے۔ حتّٰی کہ ایک دن

اپنی موجوں میں ڈوب جاتا ہے۔ یا کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے ؎

ٹھوکریں کھاتے پھروگے ان کے در پر پڑ رہو
قافلہ تو اے رضاؔ اوّل گیا، آخر گیا

؎ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

تعلق بالرسول کا احساس، عبقریت کے راہوار بے مہار کو سنت و شریعت کے نظم و ضبط کی عنان ڈال دیتا ہے۔ زبردست کو زیردست کے آگے مسخر کر دیتا ہے۔ مذکورۂ بالا واقعے کی طرف پھر پلٹیئے! مولانا احمد رضا، بچے کو چپت تو مار بیٹھے۔ مگر...... اگلے دن سحری کھا کر جب مسجد کے صحن کی طرف نکلے۔ تو دو صاحب، مولوی محمد حسین (مالک طلسمی پریس)، اور رحیم اللہ خاں (ملازم)، اس وقت موجود تھے۔ ان سے کہنے لگے: "میں جو کارروائی کرنے والا ہوں، تم لوگ اس میں مخل نہ ہونا۔" بعدازاں اُس بچے کو بلوا بھیجا۔ اور اُس سے فرمایا: "شام کو میں نے غلطی کی، جو تمہارے چپت مارا۔ دیر سے بھیجنے والے کا قصور تھا، تم بے قصور تھے۔ لہٰذا تم میرے سر پر چپت مار کر بدلہ لے لو۔" ساتھ ہی سر سے ٹوپی اتار دی، اور لگے اصرار کرنے۔ بچہ حیرانی اور خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ تاہم اُس نے کہا: "میں نے معاف کیا۔" فرمایا: "تم نابالغ ہو، معاف کرنے کا حق نہیں رکھتے، بدلہ لے لو" بچہ ساکت کھڑا رہا۔ پھر آپ نے کچھ پیسے نکالے۔ اور اسے دکھا کر کہنے لگے:۔ "یہ پیسے بھی ملیں گے، تم بدلہ لے لو" آخر کار اپنے بچے کا ہاتھ پکڑ کر اس سے اپنے سر پر کئی چپتیں لگائیں۔ اور پھر کچھ پیسے بھی اسے دے کر رخصت کیا۔

اس سے جزوی مشابہت رکھنے والا ایک واقعہ، اقبال کے ہاں بھی پیش آیا۔

جیسے "مثنوی اسرار و رموز" میں، اس تفصیل اور اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ واقعہ اقبال پر گہرے اثرات چھوڑ گیا تھا۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ ایک مرتبہ ایک سائل ان کے دروازے پر آیا۔ اور مسلسل صدا دینے لگا۔ اقبال نے غصے میں آکر اُسے لاٹھی دے ماری۔ اس پر اقبال کے والد تڑپ اُٹھے۔ اور فرمانے لگے:

کل میدانِ قیامت میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت، ان کے سامنے حاضر ہوگی۔ اور جب حضورؐ مجھ سے دریافت فرمائیں گے: — "خدا نے تمہیں ایک مسلم نوجوان عطا کیا۔ مگر تم اس میں میرے اخلاق و آداب کی کوئی جھلک پیدا نہ کر سکے"۔ — تو میں کیا جواب دے سکوں گا؟ ؎

اے صراطت مشکل از بے مرکبی | من چہ گویم چو مرا پرسد نبی
"حق جوانے مسلمے با تو سپرد | کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کار آسان ہم نشد | یعنی آں انبارِ گل آدم نشد"

○

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر | اجتماعِ اُمّتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر | لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن | پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰؐ
گُل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰؐ

ان واقعات کے آئینے میں آپ عشقِ رسول کی اُس قوت، کا جلال و جمال ملاحظہ کرتے ہیں۔ جو طاقتور فریق کو، شریعتِ محمدیؐ کے ضابطے میں محصور کرتی ہے۔ اور ناتوان کو توانا پر فتح دلا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ دُنیا جس میں سلطان مراد ایک معمار

کے ہاتھ کے بدلے میں، اپنا ہاتھ کٹوا دینے کے لئے اپنے ہی مقرر کردہ قاضی کے سامنے
حاضر ہو جاتا ہے ؎

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر

جب شریعت کے ساتھ، بندۂ مومن کا رابطہ، عشقِ رسول کی راہوں سے قائم ہوتا ہے۔
تو شریعت، اس کے لئے ضابطہ و قانون سے بڑھ کر، فرمانِ حبیب کی حیثیت اختیار
کر لیتی ہے۔ شریعت تو ظاہر پر معاملہ کرتی ہے۔ لیکن فرمانِ حبیب کی سلطنت ظاہر
و باطن دونوں پر ہے۔ ظاہر ہے، کہ عشق کا مزاج ہی اضطراب اور بے کلی ہے۔ جو
ضابطہ بندیوں سے وراء ہو کر تڑپنا مچلنا چاہتا ہے۔ لیکن عشقِ نبی میں عجیب انفرادیت
یہ بھی ہے۔ کہ بے قراری کے ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہاں
عشاق، فرمانِ حبیب کے احترام سے قدم آگے نہیں بڑھاتے ؎

پیشِ نظر وہ نو بہار سجدے کو دل ہے بے قرار
روکئے سر کو روکئے ہاں یہی امتحان ہے (رضاؔ)

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست — پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰ است
ورنہ گردِ تربتش گردیدمے (اقبالؔ) — سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

یہ بھی ایک حسین اتفاق ہے۔ کہ دونوں شخصیتوں کے والد، سرمایۂ حُبِّ رسول
سے بہرہ مند تھے۔ اور ہر دو شخصیتوں کو یہ دولت، اپنے اپنے والد سے میراث
میں ملی۔ اقبال مرحوم کے والد شیخ نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے یہ گوشے
تو اب منظرِ عام پر جگمگانے لگے ہیں۔ مولانا احمد رضا کے والد ماجد، مولانا نقی علی
خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گئے۔ حج کے دن تھے، رات
خواب میں سفرِ حج کا کچھ اشارہ ہوا۔ صبح اُٹھ کر تیاری شروع کر دی۔ عرض کیا گیا۔

"اس ضعفِ مرض میں سفر کیونکر ہو سکے گا۔ اگلے سال پر رہنے دیجئے" فرمایا: "مجھے ایک بار، قصدِ مدینہ سے پاؤں، دروازے سے باہر رکھنے دو۔ پھر خواہ روح اُسی وقت پرواز کر جائے ۔۔۔" چنانچہ تشریف لے گئے، اور حج و زیارت کے جملہ ارکان، ایک تندرست و تنومند انسان کی طرح ادا کئے۔

برِعظیم کی تاریخ میں یہ دو باپ کیسے فیض رساں نکلے۔ جنہوں نے محبت نبوی کا سرمایہ اپنے عظیم فرزندوں کی طرف منتقل کیا۔ اور فرزند بھی واقعی عظیم، بلکہ عظیم تر ثابت ہوئے۔ جن سے ہماری تیرہ فضاؤں میں، عشقِ رسول کے چراغ جگمگا اُٹھے۔

گونج گونج اٹھے ہیں نغماتِ رضؔا سے بوستاں
کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وا منقار ہے
نکلی تو لبِ اقبالؔ سے ہے، کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

پھر ہماری زیرِ مطالعہ، ان ہر دو شخصیتوں کو، زبردست ملکۂ شعری ہونے کے باوجود، شاعر کہلانے پر کچھ فخر محسوس نہیں ہوتا۔ وہ شاعری کے بجائے اپنے مشن کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اقبالؔ تو اس بات کا شکوہ، دربارِ رسالت میں پیش کرتے ہیں۔ کہ لوگوں نے انہیں بس ایک غزلخوان تصور کر لیا ہے۔

من اے میر اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

احمد رضا بھی مطلقاً رنگین نوائی کا انکار کرتے ہیں۔ فخر ہے تو مدحِ حبیب پر ہے۔

ہے بلبلِ رنگیں رضاؔ، یا طوطیِ نغمہ سرا
حق یہ کہ واصف ہے ترا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

مولانا احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا حال تو یہ ہے۔ کہ اوّل تو نعتِ رسول سے ہٹ کر بمشکل ہی آپ نے کوئی شعر کہا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی مثال ملتی بھی ہے۔ تو اس میں وہ چمک اور عظمت محسوس نہیں ہوتی۔ جو حدائقِ بخشش [مجموعۂ نعت] میں جلوہ گر ہے۔ مثلاً "الاستمداد" کی نظم کے وہ اشعار، جن میں تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے: ؎

حامد منی انا من حامد — حمد سے ہمد کماتے یہ ہیں
میرے ظفر کو اپنی ظفر دے — اس سے شکستیں کھاتے یہ ہیں
میرا امجد، مجد کا پکا — اس سے بہت کچھ پاتے یہ ہیں

اس کی وجہ، میرے خیال میں تو یہی ہے، کہ در اصل مولانا ان لوگوں میں داخل ہیں، جن کا مقام:

"قوتِ قلب وجگر گردد نبی"

قرار پا جاتا ہے۔

عشقِ رسول کے فیضانات میں، ایک فیضانِ بے پایان وہ دولتِ فقر ہے۔ جس کی نگاہ میں دارا و سکندر ہیچ ہو جاتے ہیں مگر اس فقر کے دو پہلو ہیں۔ جب اس کا رُخ، دیارِ حبیب کی طرف ہوتا ہے۔ تو یہ سراپا فقر و مسکنت اور پیکرِ عجز و تذلّل بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے۔ کہ کوئے دوست میں سر کے بَل چلے ؎

حرم کی زمین اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

وہ اپنے دل کو ملامت کرتا ہے۔ کہ تو کیوں نہ پارہ پارہ ہو کر، سگانِ مدینہ کی نذر کیلئے نکل پڑا: ؎

پارۂ دل بھی نہ نکلا، دل سے تحفے میں رضاؔ
اُن سگانِ کُو سے اتنی جان پیاری واہ واہ

اور جب مولانا احمد رضا، دوسری بار حج کے لئے تشریف لے گئے۔ تو زیارت نبی کی آرزو پر، روضۂ اطہر کے سامنے، دیر تک صلوٰۃ وسلام پڑھتے رہے۔ مگر پہلی رات کے مقدر میں یہ سعادت نہ تھی۔ مولانا نے اس موقع پر وہ معروف نعتیہ غزل لکھی۔ جس کے مطلع میں دامانِ رحمت سے وابستگئ امید دکھائی ہے ؎

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

لیکن مقطع میں، مذکورہ واقعہ کی یاس انگیز کیفیت کے پیش نظر، اپنی بے مائگی و خواری کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضاؔ
تجھ سے کتے ہزار پھرتے ہیں

آپ کے سوانح نگاروں کا بیان ہے۔ کہ اس انداز میں عرضِ تمنّا کے بعد قسمت جاگ اٹھی۔ اور شانِ رأفت نے لطف وکرم سے نواز دیا ؎

اُن کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں
جس راہ چل دیئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں
جب آگئی ہیں جوشِ رحمت پہ اُن کی آنکھیں
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں

اقبال بھی جب عالمِ تصور میں، دیارِ حبیب کی زیارت کرتا ہے۔ تو سراپا عجز و نیاز بن کر صحرائے عرب کے ذرّے اپنی آنکھوں سے چُنتا ہے۔

سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں برو بم از مژہ خاکِ درِ دوست

اور اس کے ہاں بھی ایک تمنائے حسین مچل رہی ہے۔ مگر امید و یاس کے کناروں کے درمیان کھڑا ہے۔ اپنی جانب دیکھتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے، کہ کیا میں اس دربار میں اپنی آرزو پیش کرنے کے قابل ہوں۔ ادھر شانِ رحمت پر نظر پڑتی ہے۔ تو حوصلہ بڑھ جاتا ہے: ؎

زندگی را از عمل سامان نبود — پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہارِ او آید مرا — شفقتِ تو جرأت افزاید مرا
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
فرخا شہرے کہ تو بودی دراں — اے خنک خاکے کہ آسودی دراں

"مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من
پیشِ عاشق ایں بود حب الوطن"

یہ فقرِ عاشق کا عجز و نیاز، درِ محبوب کے ساتھ ہی تعلق رکھتا ہے۔ جب معاملہ دوسروں کا آن پڑتا ہے۔ تو پھر یہ فقر، فقرِ غیور ہے۔ جو تاجدارانِ دنیا کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کیونکہ کوئے حبیب میں وہ سب کو گدا دیکھتا ہے: ؎

اس گلی کا گدا ہوں مَیں جس میں
مانگتے تاجدار پھرتے ہیں

عشق اور فقر کے مزاج کی غیر تمندی کبھی گوارا نہیں کرتی۔ کہ اہلِ دُنیا کی قصیدہ خوانی کی جائے۔ اور ادنیٰ مقاصد کے لئے چادرِ فقر کو بٹہ لگایا جائے۔

یہاں فریدالدین عطارؒ کا طریق ہی زیب دیتا ہے: ؎

بعمرِ خویش مدحِ کس نہ گفتم
دُرے از بہرِ دُنیا سں نسفتم

خودی کے محافظ لقمۂ دریوزہ کے کبھی خواہاں نہیں ہوتے۔ وہ پیٹ کی مار

کھانے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں، کوتاہی پرواز پر راضی نہیں ہو سکتے۔ یہ نعرۂ مستانہ ہمیشہ عشق کی طاقت سے سربلند رہا ہے۔ کوئی امام مالک ہوتا ہے، جو اقتدارِ وقت کی طرف سے منصب اور مال کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کرتا ہے: ؎

گفت مالک مصطفٰے را چاکرم ۔۔۔ نیست جز سودائے او اندر سرم

تو ہمی خواہی مرا آقا شوی ۔۔۔ بندۂ آزاد را مولا شوی

عشق می گوید کہ فرمانم پذیر
پادشاہان را بخدمت ہم مگیر

اور یا پھر متاخرّ زمانے کا احمد رضا ہوتا ہے۔ جس کا ماحول حکمرانوں اور نوابوں کی شان میں الاپے جانے والے راگوں سے گونج رہا تھا۔ مگر اس نے کہا ؎

کروں مدح اہلِ دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا، میرا دین پارۂ ناں نہیں

قاضی عبد النبی کوکب

لاہور۔ ۳۰ صفر ۱۳۸۸ھ / ۲ مئی ۱۹۶۸ء

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا شاہ احمد رضا خاں اور انکے رفقاء کی سیاسی بصیرت

(حکیم محمد موسیٰ امرتسری)

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رستاخیز کے بعد، ہندوؤں کی متعصبانہ، مسلم کُش سیاست نے ایک ٹمٹماتے ہوئے ستارے کی طرح اپنا سفر شروع کیا۔

لیکن بیسویں صدی کے آغاز تک، برعظیم پاک وہند کے مطلع سیاست پر، ہندو لیڈروں کا اثر و رسوخ، آفتاب درخشاں بن کر چمک رہا تھا۔ گاندھی کی نقاب پوش سیاست نے ہندو مسلم اتحاد کے پردے میں، مسلمانوں کو سیاسی، دینی اور تہذیبی اعتبار سے تلاش کر کے رکھ دینے کے جو منصوبے تیار کئے تھے، بہت کم زعماء، ان کے مضمرات سے، بروقت آگاہ ہو سکے تھے۔ تاہم علمائے دین کے بعض حلقوں میں، اس پر شدید اضطراب محسوس کیا جانے لگا۔ اگرچہ دوسری طرف بھی علماء ہی کی ایک کثیر تعداد تھی، جو اپنے مدارس و مکاتب اور تبلیغی اداروں کی تمام تر قوتوں سمیت، ہندو لیڈروں کی دعوت پر لبیک

کیہ رہی تھی۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی لَے میں، اپنے دینی و ملی شعائر کے معاملہ میں بھی کمزوری دکھائی جا رہی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے، کہ علماء ہی کی صفوں میں ایسے مردانِ حق بھی موجود تھے۔ جنہوں نے اس طاغوت کے سر پر ضرب کاری لگائی۔ اس سلسلے میں علمائے بریلی، حضرت مولانا احمد رضا خان قدس سرہٗ العزیز اور ان کے بعض رفقاء مثلاً مولانا سید سلیمان اشرف اور مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) کی خدمات بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ برِ عظیم میں تحریک آزادی کی تاریخ، اور مسلمانانِ پاک و ہند کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں دل چسپی لینے والے فضلاء اور طلبہ کے لئے، اس گوشے میں ایک اہم خزانہ ابھی تک محفوظ ہے۔ جسے تاحال منظرِ عام پر لانے کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے اسباب کی نشاندہی ممکن ہے، ہم اس موضوع پر کسی تفصیلی مقالے میں، روشنی ڈالیں گے، سرِ دست ان سطور میں، مذکورہ بالا علماء کی بعض تحریرات پیش کرنا مقصود ہے۔ تاکہ اس موضوع پر کام کرنے والے اصحاب، متعلقہ ماخذ کو سامنے رکھ کر، اس کام کو آگے بڑھا سکیں۔

سب سے پہلے مولانا سید سلیمان اشرف کی تالیف "النور" کے آغاز سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے تھے۔ مولانا کی یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ نے شائع کیا تھا۔ اور اس کے ٹائٹل پر یہ الفاظ درج ہیں:۔ "حالاتِ حاضرہ پر ایک مصلحانہ نظر"۔ مولانا موصوف نے تین چار ریروں میں، ۱۸۵۷ء سے اپنے دَور تک کی، ہندو لیڈروں کی شاطرانہ سیاست کا جائزہ لیا ہے، لکھتے ہیں:

"سن ستاون (۱۸۵۷ء) کا ہنگامہ اور ستارۂ صلاح و فلاح مسلمانانِ ہند کا غروب، مفہوم مرادف ہے۔ مسلمانوں کے اس تنزل سے، ان کی ہمسایہ قوم نے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور بہت جلد مسلمانوں کے املاک اور دیگر جاہ و عزت کے سامان اہلِ ہنود کے دستِ تصرف میں آگئے۔ ہندوؤں کو جب اس طرف سے ایک گونہ اطمینان پیدا ہوگیا۔ تب انھوں نے مسلمانوں کے مذہب پر حملہ آوری شروع کی۔ مظالم و جفاکاری کا ایک کوہ آتش فشاں تھا، جس سے انواع و اقسام کے شعلے پھوٹ کر نکلتے اور جا بجا مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو، ان کے حقوق کے ساتھ خاکِ سیاہ کرنا چاہتے تھے۔

یوں تو مسلمانوں کا ہر رکنِ مذہبی اہلِ ہنود کو چراغپا کر دینے کا کافی بہانہ تھا، لیکن بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی سے جو تلاطم اور ہیجان ان میں پیدا ہوتا ان کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ لیکن غیر ممتند مسلمان اپنے دینی حق اور مذہبی استحقاق کے قائم رکھنے میں ہمیشہ استقلال و ہمت سے اُن ستمگاروں کی مدافعت کرتے رہے۔

محض سفاکی و بے رحمی کو چند سال کے تجربہ نے جبکہ ناکافی ثابت کیا تو اہلِ ہنود تدابیر و حیل کی آمیزش اپنی جفاکاری میں ضروری سمجھ کر تدلیس و تلبیس سے بھی کام لینے لگے۔ چنانچہ ۱۲۹۸ھ میں اہلِ ہنود نے ایک عبارت استفتا مرتب کر کے بنام زید و عمر مختلف شہروں سے متعدد علمائے کرام کی خدمت میں روانہ کی۔

استفتا میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ موقع بقرعید پر گائے کی قربانی جبکہ موجب فتنہ و فساد ہے اور امن عامہ میں اس کی وجہ سے خلل آتا ہے، اگر مسلمان گائے کی قربانی موقوف کر دیں تو کیا مضائقہ ہے۔

حضرات علماء نے نہایت مدلل طریقہ پر اس کا یہی جواب تحریر فرمایا کہ شریعت نے جو اختیار عطا فرمایا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کا ہمیں حق حاصل ہے خوف فتنہ ہو تو حکومت کی قوت کو متوجہ کرنا چاہیئے۔ بہ پاسِ خاطر ہنود یا خوفِ ہنود اپنے دینی حق سے باز رہنا ہرگز روا نہیں۔

دو تین برس بعد پھر اسی قسم کا استفتا جاری ہوا اور پھر دربار شریعت سے یہی فتویٰ صادر رہوا۔ مولانا المفتی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا رسالہ "انفس الفکر فی قربان البقر" ۱۲۹۸ھ کا تصنیف ہے اسے ملاحظہ فرمائیے اور مجموعہ فتاویٰ مولوی عبد الحی صاحب مرحوم مطالعہ کیجیئے۔ ساری حقیقت واضح ہوجائے گی، اس کے بعد ۱۳۲۹ھ میں پھر اسی سوال کا اعادہ کیا گیا اور دار الافتاء سے اُسی اگلے جواب کا اعادہ فرمایا گیا۔

گویا اور مئو میں جب ہندوؤں نے ایک حشر عظیم بپا کیا اور بعد قتل و غارت گری اور بے حرمتیِ مساجد، اس کوشش میں سرگرم ہوئے کہ حکّامِ کچہری پر یہ ثابت کریں کہ قربانی گاؤ سے ہندوؤں کی دل آزاری ہوتی ہے اور گائے کی قربانی حسبِ اجازت مذہبِ اسلام نہیں۔ اس وقت علّامہ چریا کوٹی، مولانا محمد فاروق صاحب عباسی نے ایک رسالہ چھپوا کر شائع فرمایا، جس میں دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے اچھی طرح ثابت فرمادیا کہ اہلِ ہنود کا ادعائے باطل محض بے بنیاد ہے۔ نیز واقعۂ مئو کی مستند تاریخ ایک مسدّس کی نظم فرمائی جو ہندوؤں کے مظالم اور مسلمانوں کی مظلومیت و استقامت کی ہو بہو تصویر ہے۔ یہ دونوں رسالے چھپ کر ملک میں شائع ہو چکے ہیں۔

اشارات صدر سے صرف اس قدر ثابت کرنا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے

شعارِ دین کی توہین اور ارکانِ مذہبی کے نیست و نابود کرنے میں اپنی پوری جسمانی، مالی اور دماغی قوت گوناگوں طور پر صرف کرنے میں پچاس برس سے مسلسل ساعی و کوشاں ہیں۔ لیکن علمائے کرام اور عامہ مسلمین آجتک اُن کے دامنوں میں پناہ لینے سے اظہار بیزاری کرتے ہیں۔" (النور۔ص ۱-۳)

اس کے بعد آگے چل کر اس دور کا نقشہ کھینچا ہے۔ جبکہ کانگرس کے حامی علمار کی "مساعیٔ جمیلہ" سے، مسلمانوں کو رام کر لیا گیا تھا۔ اور ہندو تہذیب کے شعائر، مسلمانوں کے دینی نشانات پر غلبہ و تفوق پا رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ نام نہاد علمار کی سرپرستی اور نگرانی میں کیا جا رہا تھا۔

"...... گائے کی قربانی، مسلمانوں سے چھڑائی جاتی ہے۔ موحدین کی پیشانیوں پر قشقہ، جو شعارِ شرک ہے، کھینچا جاتا ہے۔ مساجد اہلِ ہنود کی تفرج گاہیں، مندر مسلمانوں کا ایک مقدس معبد ہے۔ ہولی شعارِ اسلام ہے جس میں رنگ پاشی اور وہ بھی خاص اہلِ ہنود کے ہاتھوں سے جبکہ وہ نشہ شراب میں بدمست ہوں عجب دل کش عبادت ہے۔ بتوں پہ ریوڑیاں چڑھانا ہار پھولوں سے انہیں آراستہ کرنا پھولوں کا تاج اصنام کے سروں پہ رکھنا خاص توحید ہے۔ یہ سارے مسائل ان صورتوں میں اس لئے ڈھل گئے کہ ہندوؤں کی دل نوازی اور استرضا سے زیادہ اہم نہ توحید ہے نہ رسالت نہ معاد۔ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!"

(النور۔ ص ۸)

حضرت مولانا احمد رضا خان قدس سرہٗ نے اس زمانے میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب "المحجۃ المؤتمنۃ" تالیف فرمائی تھی۔ اس کا حسبِ ذیل اقتباس

یہ ظاہر کرے گا۔ کہ بعض مسلمان زعمار، ہندو مسلم اتحاد کے پردے میں، دراصل ہندو تہذیب کی غلامی کے راستے پر گامزن ہو چکے تھے:

"جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری، پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خودداری، وہ تمہیں ملیچھ جانیں، بھنگی مانیں، تمہارا پاک ہاتھ جس چیز کو لگ جائے گندی ہو جائے، سودا بیچیں تو دور سے ہاتھ میں ڈال دیں، پیسے لیں تو دور سے یا پنکھا وغیرہ پیش کر کے اس پر رکھوا لیں، حالانکہ بحکم قرآن خود وہی نجس ہیں اور تم ان نجسوں کو مقدس مطہر بیت اللہ میں لے جاؤ، جو تمہارے ماتھا رکھنے کی جگہ ہے، وہاں ان کے گندے پاؤں رکھواؤ، مگر تم کو اسلامی حس ہی نہ رہا، محبت مشرکین نے اندھا بہرا کر دیا۔ ان باتوں کا ان سے کیا کہنا جن پر حبک الشئ یعمی ویصم "کا رنگ بھر گیا، سب جانے دو خدا کو منہ دکھانا ہے یا ہمیشہ مشرکین ہی کی چھاؤں میں رہنا ہے، جواز تھا تو یوں کہ کوئی کافر......

.......مثلاً اسلام لانے یا اسلامی تبلیغ سننے یا اسلامی حکم لینے کے لئے مسجد میں آئے، یا اس کی اجازت تھی کہ خود سر مشرکوں نجس بت پرستوں کو مسلمانوں کا واعظ بنا کر مسجد میں لے جاؤ؟ اسے مسند مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بٹھاؤ؟ مسلمانوں کو نیچے کھڑا کر کے، اس کا وعظ سناؤ، کیا اس کے جواز کی کوئی حدیث یا کوئی فقہی روایت تمہیں مل سکتی ہے؟ حاشا ثم حاشا للہ انصاف! کیا یہ اللہ و رسول سے آگے بڑھنا، شرع مطہر پر افترا گڑھنا، احکام الٰہی دانستہ بدلنا، سوئر کو بکری بنا کر نگلنا نہ ہوگا"

(المحجۃ المؤتمنۃ۔ ص ۸۴)

فاضل بریلوی کے بیان فرمودہ حقائق کی ایک جھلک میرے بہت سے بزرگوں اور دوستوں نے اس وقت دیکھی جبکہ گروہ علمار نے مسٹر گاندھی کو جامع مسجد

شیخ خیرالدین امرتسر میں لاکر منبر رسول پر بٹھایا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھے۔ اور یہ دعا کی گئی کہ "اے اللہ تو گاندھی کے ذریعے اسلام کی مدد فرما" (معاذاللہ)۔

بات یہاں تک ہی نہیں رہی تھی۔ اُس وقت کے ایک جید عالم نے یہ کہہ دیا ؎

عمرے کہ بآیات واحادیث گذشت
رفتی ونثار بت پرستے کردی

ایک بہت بڑے لیڈر نے یہ گوہر افشانی فرمائی کہ "زبانی جمع پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے تو خدا کو راضی کرو گے" بھائیو! خدا کی رسّی کو مضبوط پکڑو اگر ہم اُس رسّی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو چاہیے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی" ایک جلسہ میں یہ یہ کہا گیا "اے اللہ ہم سے ایک نیک کام ہو گیا ہے کہ ہیں اور مہاتما گاندھی یقینی بھائی ہو گئے ہیں۔ (النور۔ ص۔ ۲۲۶ — ۲۲۷)۔

اس خوفناک سازش کے خلاف سب سے پہلے جس نے صدائے احتجاج بلند کی وہ فاضل بریلوی کی ذات گرامی اور ان کے خلفا تھے۔ مسٹر گاندھی نے علماء پر جو فسوں کر دیا تھا۔ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ کو اس کے قلق کا اندازہ صرف اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی وفات حسرت آیات کے وقت جو وصایا ارشاد فرمائے ان میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ گاندھی کے پیروکاروں سے بچو یہ سب بھیڑیے ہیں تمہارے ایمان کی تاک میں ہیں ان کے حملوں سے اپنا ایمان بچاؤ۔

حضرت فاضل بریلوی اور ان کی تبلیغ سے سعید الفطرت علماء نے گاندھی

کی پیروی ترک کر کے اعلانیہ توبہ کی۔ ان علماء میں سے حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پھر ان کے مرید مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی۔ مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہٗ العزیز، حضرت مولانا شاہ احمد رضا نور اللہ مرقدہٗ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ انہوں نے بھی ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ "حالاتِ حاضرہ" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا۔ جس میں ترکوں کی سلطنت کے مبتلائے مشکلات ہونے، اور اس کے ساتھ برعظیم کے مسلمانوں میں درد و کرب کی ایک لہر پیدا ہو جانے کو پس منظر میں رکھتے ہوئے، ایک دردمند اور بالغ نظر مبصّر کی طرح، حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اور مسلمان لیڈروں کو ان کی غلط روش پر متنبہ کیا ہے!

"— حالاتِ حاضرہ میں، سلطنتِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ کا معاملہ سب سے اہم ہے۔ جس نے تمام عالمِ اسلام کو بے چین کر دیا ہے اور اسلامی دنیا اضطراری یا اختیاری طور پر حرکت میں آگئی ہے، جوش کے تلاطم کی کیفیت نمایاں ہے اور نو عمر بچے سے لے کر کبیر السّن شیخ تک ہر شخص ایک ہی درد کا شاکی اور ایک ہی صدمہ کا فریادی نظر آتا ہے۔

سلطنتِ اسلامیہ کی تباہی و بربادی اور مقاماتِ مقدسہ بلکہ مقبوضاتِ اسلام کا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانا ہر مسلمان کو اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی و بربادی سے زیادہ اور بدرجہا زیادہ شاق اور گراں ہے اور اس صدمہ کا جس قدر بھی درد ہو کم ہے اور اس درد سے جس قدر بے چینی ہو تھوڑی ہے، مسلمانوں کا اقتدار خاک میں ملتا ہے ان کی سلطنت کے حصے بخرے کئے جاتے ہیں۔ ارضِ اسلام کا چپّہ سے چپّہ لڑ جاتا ہے قیامت نماز لازل

بلاد اسلامیہ کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں مقاماتِ مقدسہ کی وہ خاک پاک جو اہل اسلام کی چشم عقیدت کے لیئے طوطیا سے بڑھ کر ہے کُفّار کے قدموں سے روندی جاتی ہے۔ حرمین محترمین اور بلاد طاہرہ کی حرمت ظاہری طور پر خطرہ میں پڑ جاتی ہے مسلمانوں کے دل کیوں پاش پاش نہ ہو جائیں ان کی آنکھیں کیا وجہ ہے کہ خون کے دریا نہ بہائیں۔ سلطنت اسلامیہ کی اعانت و حمایت خادم الحرمین کی مدد و نصرت مسلمانوں پر فرض ہے۔ اسلام نے تمام مسلمانوں کو تن واحد کے اعضا کی طرح مربوط فرمایا ہے ایک عضو کی تکلیف کا اثر دوسرے اعضا پر پڑتا ہے اور اعضائے رئیسہ کے صدمہ سے تمام بدن متاثر ہو جاتا ہے ۔

چو عضوے بدرد آورد روزگار

دگر عضوہا را نماند قرار

عالم اسلام کے ہر متنفس کا صدمہ دوسرے مسلمان کو محسوس ہونا چاہیئے۔ چہ جائیکہ سلطان المسلمین کا صدمہ خادم الحرمین کا درد۔

دوسرے ممالک میں کیا ہو رہا ہے یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان برابر جلسہ کر کے پرزور تقریروں میں جوش کا اظہار کر رہے ہیں۔ سلطنتِ برطانیہ سے ترکی اقتدار کے برقرار رکھنے کی درخواستیں کی جاتی ہیں۔ ترکی مقبوضات واپس دینے کے مطالبے کیئے جاتے ہیں۔ اسی مقصد کے لیئے رزولیوشن پاس ہوتے ہیں۔ وفد بھیجے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تدبیریں کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہیں لیکن امید کے لمبے لمبے ہاتھ دل آزردہ مسلمانوں کی گردنوں میں حمائل ہو کر انہیں بہلا رہے ہیں بچا رہے پھرتے ہیں، خدا کامیاب کرے مسلمانوں نے ان مساعی میں ضروری سمجھا ہے کہ ہندوؤں کو اپنے ساتھ شریک کریں اور اپنا ہم آواز بنائیں تاکہ اُن کی صدائیں زور

آئے اور سلطنت ان کی درخواست کان لگا کر سُنے۔ اگرچہ یہ مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

رفتن بہ پائمردی ہمسایہ در بہشت

لیکن مذہب کا فتویٰ اس کو ممنوع اور ناجائز نہیں قرار دیتا۔ اور اس قدر جدو جہد جواز میں رہتی ہے۔

لیکن صورت حالات کچھ اور ہے اگر اتنا ہی ہوتا کہ مسلمان مطالبہ کرتے اور ہندو ان کے ساتھ متفق ہو کر بجا ہے اور درست ہے، پکارتے، مسلمان آگے ہوتے اور ہندو ان کے ساتھ ہو کر ان کی موافقت کرتے تو بیجا نہ تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندو امام بنے ہوئے آگے آگے ہیں اور مسلمان آمین کہنے والے کی طرح ان کی ہر صدا کے ساتھ موافقت کر رہے ہیں۔ پہلے مہاتما گاندھی کا حکم ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے مولوی عبدالباری کا فتویٰ مقلد کی طرح سر نیاز خم کرتا چلا جاتا ہے۔ ہندو آگے بڑھتے ہیں اور مسلمان ان کے پیچھے پیچھے اپنا دین و مذہب ان پر نثار کرتے چلے جاتے ہیں۔

پہلے تو ہندوؤں نے سود کے پھندوں میں مسلمانوں کی دولتیں اور جاگیریں لے لیں اب وہ مفلس ہو گئے اور کچھ پاس نہ رہا تو مقامات مقدسہ اور سلطنت اسلامیہ کی حمایت کی آڑ میں مذہب سے بھی بیدخل کرنا شروع کر دیا۔ نادان مسلمانوں نے جس طرح دریا دلی کے ساتھ جائیدادیں لٹائیں آج اسی طرح مذہب فدا کر رہے ہیں۔ کہیں ہندوؤں کی خاطر سے قربانی اور گائے کا ذبیحہ ترک کرنے کی تجاویز پاس ہوتی ہیں ان پر عمل کرنے کی صورتیں سوچی جاتی ہیں۔ اسلامی شعائر مٹانے کی کوششیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ کہیں پیشانی پر قشقہ کھینچ کر کفر کا شعار (ٹریڈ مارک) نمایاں

کیا جاتا ہے کہیں بتوں پر پھول اور ریوڑیاں چڑھا کر توحید کی دولت برباد کی جاتی ہے۔ معاذ اللہ۔

کروڑ سلطنتیں ہوں تو دین پر فدا کی جائیں۔ مذہب کسی سلطنت کی طمع میں برباد نہیں کیا جا سکتا، مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے بہت خوب فرمایا کہ لعنت ہے اس سلطنت پر جو دین بیچ کر حاصل کی جائے۔ ترکی سلطنت کی بقا کے لئے مسلمان کفر کرنے لگیں شعائر اسلام کو مٹا دیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اسلام ہی کے صدقہ میں تو اس سلطنت کی حمایت کی جاتی ہے ورنہ ہم سے اور ترکوں سے واسطہ مطلب۔ جو کوشش کی جائے اپنا دین محفوظ رکھ کر کی جائے ــــ مگر ؎

اِذَا کَانَ الْغُرَابُ دَلِیْلَ قَوْمٍ　　سَیَھْدِیْھِمْ طَرِیْقَ الْھَالِکِیْنَ

جب ہندو پیشوا ہوں اور مسلمان ان کی کورانہ تقلید پر کمر باندھیں پھر مذہب کا محفوظ رکھنا کیونکر ممکن ہے۔

مسلمانوں کی نادانی کمال کو پہنچ گئی۔ نصاریٰ کے ساتھ ہوئے تو اندھے ہو کر موافقتِ بلاد اسلامیہ میں جا کر لڑے، مسلمانوں پر تلواریں چلائیں ان کے ملک ان سے چھین کر کفار کو دلائے اب اس خود کردہ کا علاج کرنے چلے اور مشتِ بعد از جنگ یاد آیا تو ہندوؤں کی غلامی میں دین برابر کرنے پر تُل گئے۔"

(حیات صدر الافاضل۔ ص۔ ۹۹ ــــ ۱۰۲)

ان چند اقتباسات سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ ملک کے سیاسی دینی مسائل میں، حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی قدس سرہٗ اور ان کے رفقاء کا موقف کیا تھا۔ اور بالخصوص۔ متحدہ ہندوستانی قومیت کی تحریک کا ردِّ عمل ان علماء کے ہاں کس شکل میں رونما ہوا۔ حضرت مولانا بریلوی نے گاندھی کے فسوں کو

توڑنے کی جو کوششیں کی تھیں اور اپنے رفقاء و خلفاء کی جس انداز میں تربیت کی تھی اس کا نتیجہ ہے کہ حضرت کے تلامذہ، خلفاء اور متبعین نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت کے خلفاء میں سے صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین اور حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی رحمہما اللہ نے تحریک پاکستان کو کامیاب کرنے کے لئے آل انڈیا سنی کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اور پاک و ہند کے ہر شہر میں اس کی شاخیں قائم کیں ۱۹۴۶ء میں بنارس میں تائید تحریک پاکستان کی خاطر ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں پانچ ہزار کی کثیر تعداد میں علماء و مشائخ شریک ہوئے۔ اور سب نے پاکستان بنانے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عہد کیا۔ مولانا مراد آبادی تو حمایت تحریک پاکستان میں اس قدر سرگرمی دکھا رہے تھے کہ اس کی مثال محال ہے۔ مولانا اپنے ایک خط میں مولانا ابو الحسنات قادری علیہ الرحمۃ کو لکھتے ہیں:

"۔۔۔ پاکستان کی تجویز سے "جمہوریت اسلامیہ" (آل انڈیا سنی کانفرنس کا دوسرا نام) کو کسی طرح دست بردار ہونا منظور نہیں، خود جناح اس کے حامی رہیں یا نہ رہیں" (حیات صدر الافاضل صفحہ ۱)

غرضکہ حضرت فاضل بریلوی اعلی اللہ مقامہ پاکستان میں بسنے والے کل مسلمانوں کے محسن ہیں۔ کہ انہوں نے بروقت گاندھی کے خطرناک عزائم سے قوم کو آگاہ کیا اور سواد اعظم کے علماء و مشائخ کے ایک عظیم گروہ کی ایسی تربیت کر گئے کہ انہوں نے نہایت خلوص و دیانت کے ساتھ تحریک پاکستان کو کامیاب کیا۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا یہ مضمون ہر لحاظ سے نامکمل اور تشنہ ہے ۔۔۔ بہر حال میں نے مورخین کو تحریک پاکستان کے ایک فراموش شدہ مگر اہم باب کی طرف توجہ دلا دی ہے ۔

○

درثنائے خواجہ گوہر سُفتہ است

مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کی نعت گوئی

خالق کائنات نے، کمالات و محاسن نبوّت کا بیان فرماتے ہوئے، اگرچہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ سے شاعری کی نفی فرمائی ہے اور شاعروں کو گمراہ، بھولے بھٹکے اور گفتار کے غازی جیسے القاب سے یاد فرمایا ہے، لیکن "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کی حد لگا کر پاکیزہ خیال شعراء کو اس ضابطے سے مستثنیٰ قرار دیا۔ چنانچہ اسلامی شاعری کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس کے ڈانڈے خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے سے جا کر ملتے ہیں۔

تاریخ و سیر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "ما ھو شاعرٌ" کے مصداق جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے مسجدِ نبوی میں منبر کا اہتمام فرماتے اور اُن کے رجز اور نعت و مدحت سے مملو اشعار پر داد و تحسین فرماتے اور بلند پایہ اشعار

پر "اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" اور "قَاتَلَکَ اللّٰہُ مَنْ حَرَّ النَّارَ" کی دعاؤں سے نوازتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے شاعری فی نفسہٖ ناجائز اور بری نہیں ہے۔

حضرت حسان ابن ثابت، حضرت عبد اللہ ابن رواحہ، اور حضرت کعب ابن زہیر رضی اللہ عنہم عہد رسالت کے بلند پایہ نعت گو شاعر تھے۔

حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ ایک شعر آج بھی چودہ سو سال کی نعتیہ شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا!

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

(یعنی اے محمدؐ تو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے، گویا تو بعینہٖ ایسا پیدا کیا گیا ہے جیسا کہ تو خود چاہتا تھا۔)۔

اور حضرت کعب ابن زہیر کا مشہور عالم قصیدہ ع

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِی الْیَوْمَ مَتْبُوْلُ

عربی ادب کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب اسلام کی ضیا پاش کرنیں عجم میں پہنچیں تو عجمی شاعری میں بھی حجازی لے شامل ہو گئی اور ادبیاتِ پارس کا ہر شاہکار حضورؐ کے ذکر جمیل سے مزین نظر آنے لگا۔ چنانچہ رودکی سے لے کر حافظ و جامی، سعدی و رومی، عُرفی و غالب اور اقبال و گرامی تک فارسی کا کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آئے گا جس نے (کلاً یا جزاً) اپنی شاعری کو سرورِ کائنات، کی مدحت سے مشرف نہ کیا ہو۔

ہندوستان میں نعت کے سب سے پہلے باقاعدہ شاعر حضرت شہاب الدین مہرہ بدایونی (المتوفی ۷۰۱ھ) تھے۔ جو سلطان شمس الدین، التمش کے زمانے

سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین رقمطراز ہیں:

"ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمانی کے قصائد شروع سے آخر تک پڑھ جاؤ شہاب سے پہلے ہندوستانی شعراء کے کلام کا غور سے مطالعہ کرو تم کو ایک قصیدہ بھی حمد یا نعت میں نہیں ملے گا۔"

(ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء صفحہ ۱۶۷)

حضرت شہاب الدین مہمرہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شہِ تخت کن محمّد کہ سرادقِ شرف زد
بسوئے درِ مہیمن، زسرائے اُمِّ ہانی
بشرے ملک لطافت فلکی زمین تواضع
چو فلک بہ پاک جسمے چو ملک بہ پاک جانی
گہرے کہ بود جایش بخزانۂ الٰہی
قمرے کہ تافت نورش زسپہرِ جاودانی
شکریں زباں رسولے کہ بود نجاتِ اُمّت
بہ عقیدۂ زبانش زعقیلۂ زبانی

حضرت مہمرہ کے بعد (اُن کے شاگرد) حضرت امیر خسرو کی شاعری میں نعت و مدحت کے بلند پایہ شاہکار نظر آتے ہیں۔ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسا ہو جس نے خسرو کی اس غزل سے لطف نہ اٹھایا ہو ؎

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمّد شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

فارسی شعراء کے اتباع میں اردو شعراء نے بھی تبرک کے طور پر حمد کے بعد نعت ہی سے اپنے دواوین کا آغاز کیا یہاں تک کہ ہندو شعراء کے دواوین بھی اس

رسم سے خالی نظر نہیں آتے۔

اگر اُردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو نعت گو شعراء پر کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں مگر افسوس کہ ادب اُردو کے تذکرہ نگاروں اور ناقدین نے اس صنفِ سخن پر کوئی خاص توجہ نہیں دی حالانکہ فنِ نعت گوئی محض مذہبی چیز ہی نہیں بلکہ اس نے اردو ادب کو آگے بڑھانے میں بھی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔

مولانا کرامت علی شہیدی، محسن کاکوروی، رضوان مرادآبادی، بیدل رامپوری، شاہ نیاز بریلوی، بیان میرٹھی، کافی مرادآبادی، عزیز لکھنوی، امیر مینائی، کیف ٹونکی، حسرت موہانی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا حسن بریلوی، ظفر علی خاں اور ان کے علاوہ بہت سے مشاہیر شعراء نے نعت و مدحت میں وہ وہ شاہکار پیش کئے ہیں کہ جن پر اُردو ادب جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔

آج کی صحبت میں اُردو کے اِن بیسیوں بلند پایہ اور نامور شعراء میں سے صرف احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نعت گوئی پر کچھ عرض کرنا مقصود ہے کہ جن کی نعتیہ شاعری بلاشبہ اردو زبان کا قابلِ فخر سرمایہ ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی جس پایہ کے انسان اور جس مرتبے کے جید عالم تھے شاعری ان کے لئے طرۂ امتیاز اور شرفِ کمال نہیں بن سکتی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے جو بلند پایہ نعتیں لکھی ہیں ان سے ان کا کوئی مخالف بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ مولانا برصغیر پاک و ہند میں اس تحریک کے داعی اور اس نصب العین کے علمبردار تھے جس نے ایک خاص وقت میں عشقِ رسول کا نعرہ بلند کیا۔ مولانا کے مسلک سے اختلاف کرنے والے ممکن ہے آپ کو بہت سے حضرات ملیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ اُن کے کمالِ نعت گوئی سے کسی کو

اختلاف ہو، مولانا کی نعت گوئی میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ ویسے ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں لیکن کم از کم مجھے آج تک پڑھے لکھوں میں مولانا کی نعت گوئی سے اختلاف کرنے والا کوئی نہیں ملا۔ اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی سن لیجیے۔

غالباً ۱۹۵۹ء کے نصف آخر کا ذکر ہے کہ مجھے ملتان میں یوم حسین کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے وہاں جانا پڑا۔ یوم حسین کا یہ جلسہ ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا اور اس میں شرکت کے لیے بڑے بڑے اہل علم تشریف لائے۔ —— شرکائے جلسہ کو مختلف جگہوں پر ٹھہرایا گیا۔ میں، مولانا ماہر القادری، مولانا محمد جعفر ندوی پھلواروی اور کوثر نیازی چاروں مولانا باقر خان امیر جماعت اسلامی ملتان کی کوٹھی میں ٹھہرے۔ رات کو سونے سے قبل یہ دلچسپ مذاکرہ چھڑ گیا کہ اُردو کا سب سے بڑا نعت گو شاعر کون ہے؟ اردو کے بڑے بڑے شاعروں کے اشعار مقابلے کے لیے پیش ہونے لگے، کافی دیر تک یہ مباحثہ جاری رہا بالآخر اس بات پر سب متفق ہو گئے کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے اچھے نعتیہ اشعار (زیادہ تعداد میں) اردو کے کسی شاعر نے نہیں کہے —— میں اس وقت تک مولانا کے نام سے تو ضرور واقف تھا مگر کلام سے واقف نہ تھا، بعد میں اُن کا مجموعہ کلام "حدائق بخشش" دیکھا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی۔

حضرت محدث کچھوچھوی نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرائے اردو میں مولانا احمد رضا کی نعت گوئی متفقہ طور پر بلند پایہ تسلیم کی جاتی ہے۔ محدث صاحب فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ لکھنؤ کے ادیبوں کی شاندار محفل میں اعلیٰ حضرت کا قصیدہ معراجیہ، میں نے اپنے انداز میں پڑھا تو سب جھومنے لگے میں نے اعلان کیا کہ اردو ادب کے نقطۂ نظر سے میں ادیبوں کا

فیصلہ اس قضیہ کی زبان کے متعلق چاہتا ہوں تو سب نے کہا کہ اس کی زبان تو کوثر کی دھلی ہوئی زبان ہے'

اسی قسم کا ایک واقعہ دہلی میں پیش آیا تو سر آمد شعراء دہلی نے جواب دیا کہ ہم سے کچھ نہ پوچھئے آپ عمر بھر پڑھتے رہیئے اور ہم عمر بھر سنتے رہیں گے۔" (مجدد اسلام۔صفحہ ۱۶۴)

جناب افتخار اعظمی باوجود اختلافِ مسلک، مولانا کی نعت گوئی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

احمد رضا خاں بریلوی کے مسلک سے اختلاف ممکن ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غیر معمولی ذہین اور متبحر عالم تھے وہ عالمِ دین کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے اس لیے ان کی شاعرانہ تخلیقات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی حالانکہ ان کا نعتیہ کلام اس پایہ کا ہے کہ انہیں طبقۂ اولیٰ کے نعت گو شعراء میں جگہ دی جانی چاہیئے انہیں فن اور زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کے یہاں تصنع اور تکلف نہیں بلکہ بے ساختگی ہے چونکہ رسول پاک سے انہیں بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اس لیے ان کا نعتیہ کلام شدّتِ احساس کے ساتھ ساتھ خلوص جذبات کا آئینہ دار ہے۔

(ارمغانِ حرم۔صفحہ ۱۴)

حدائق بخشش مولانا کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس میں حمد و نعت، دعا و التجا، سلام و منقبت، عشق و محبت، حقیقت و معرفت، معجزات و کرامات، شرح آیات و احادیث، غرض سب کچھ ہے۔

مولانا فطری طور پر ذہین، طبّاع اور پُرگو تھے، کوئی موضوع ایسا

نہیں جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ مذہب، عقائد، فقہ، تاریخ، اور سیرت پر اُن کی کم و بیش ایک ہزار کتب موجود ہیں۔ فتاویٰ رضویہ ان کے تبحر علمی اور تفقہ فی الدین کا اعلیٰ نمونہ ہے اور ان کا کیا ہوا ترجمہ قرآن تو سچ مچ اردو ادب کی جان ہے اُسے پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اِس الہامی کتاب کی ترجمانی کے لئے ایسی ہی الہامی زبان کی ضرورت تھی۔

مولانا نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ہر صنف کا حق ادا کیا ہے۔ ان کا مشہور مقطع ہے ؎

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلّم
جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

تو یہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فصاحت و بلاغت، حلاوت و ملاحت، لطافت و نزاکت یہ سب ان کے ہاں کی لونڈیاں ہیں۔

مولانا کی شاعری میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ اُن کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے والہانہ عقیدت و محبت ہے، جو ان کے ایک ایک شعر سے ٹپکی پڑتی ہے

مولانا کی نعتیہ شاعری میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے نعت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پرانے شعراء کے اندازِ تخاطب کو یکسر بدل ڈالا اور شاعری میں آداب نبوت اور مقامِ رسالت کا خاص طور پر خیال رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محض شاعر ہی نہیں تھے بلکہ مقامِ نبوت کے شناسا اور عارف بھی تھے۔ اس ضمن میں اگر ایک واقعہ درج کر دیا جائے تو شاید بے محل نہ ہو۔

اُردو کے بلند پایہ شاعر حضرت اطہر ہاپوڑی نے ایک نعت لکھ کر مولانا کی

خدمت میں بھیجی جس کا مطلع تھا ؎

کب ہیں درخت حضرتِ والا کے سامنے
مجنوں کھڑے ہیں خیمۂ لیلیٰ کے سامنے

مولانا یہ مطلع سُن کر برافروختہ ہوئے اور فرمایا مصرعِ ثانی مقامِ نبوت سے فروتر ہے حضور کو لیلےٰ سے اور گنبدِ خضریٰ کو خیمۂ لیلیٰ سے تشبیہہ دینا عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہیں۔ آپ نے قلم برداشتہ اصلاح فرمائی ؎

کب ہیں درخت حضرتِ والا کے سامنے
قدسی کھڑے ہیں عرشِ معلیٰ کے سامنے

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شعراء نعت گوئی میں شریعت کا احترام ملحوظ نہیں رکھتے، لیکن آپ کے ہاں یہ بات نہیں، آپ کی نعتوں میں شریعتِ مطہرہ کا احترام مکمل طور پر نظر آتا ہے۔ اِس کی وجہ وہ خود ایک رباعی میں بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نعت گوئی قرآن حکیم سے سیکھی ہے ؎

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ
بیجا سے ہے اَلمِنّۃُ لِلّٰہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

نعت گوئی بڑا مشکل فن ہے اس لئے کہ اس کے دونوں طرف تنقیص و توحید کی حدبندی ہے۔ اس راہ کی مشکلات کا احساس خود مولانا سے سنئے، فرماتے ہیں:

"حقیقتاً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل ہے جس کو لوگ آسان

سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے اگر بڑھتا ہے تو الوہیت
میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔ البتہ حمد
آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے
غرض حمد میں ایک جانب اصلا کوئی حد نہیں اور نعت شریف میں
دونوں جانب سخت حد بندی ہے "

(الملفوظ حصہ دوم۔ صفحہ ۱۱۳)

یہی وجہ ہے کہ آپ کا بیشتر کلام قرآن و حدیث کی تفسیر و ترجمانی پر مبنی ہے۔
اکثر مقامات پر آپ نے حدیث و قرآن کے الفاظ بعینہ اپنے اشعار میں داخل
فرمائے ہیں مثلاً:

من زار تربتی وجبت له شفاعتی
اُن پہ درود جن سے نوید ان بشر کی ہے

بعض مقامات پر وہ قرآن پاک اور حدیث نبوی ﷺ کی عبارت کا کچھ حصہ
لکھ کر آیۂ کریمہ اور حدیثِ پاک کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں، مثلاً:

اُن پر کتاب اُتری بیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ
تفصیل جس میں ما عبر و مَا غبر کی ہے

اسی طرح بعض اشعار میں وہ قرآنی آیات کے مفہوم کی طرف اشارہ کر دیتے
ہیں۔ مثلاً

ترے خلق کو حق نے عظیم کہا ترے خلق کو حق نے جمیل کہا
کوئی تجھ سا ہوا نہ ہوگا شہا ترے خالق حسن ادا کی قسم

دیکھئے اس شعر میں " و انک لعلیٰ خلق عظیم" اور " وَلَقَدْ خَلَقْنَا
الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ " کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

نعت پڑھنے والا اس بات کا متوقع ہوتا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے اور بے مثل انسان کی شخصیت کا پرتو الفاظ کے آئینے میں دیکھے۔ مولانا کی نعتیں پڑھ کر بلاشبہ یہ توقع پوری ہوتی ہے۔ وہ اپنی نعتوں میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مولانا نے حضور پاکؐ کی پاکیزہ سیرت کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مولانا نے حضور پاکؐ کے معجزات کی طرف بھی بڑے حسین انداز میں اشارے کئے ہیں۔ اس سلسلے میں بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر یہاں صرف ایک نظم کے چند اشعار درج کرتا ہوں۔ معراج کے موضوع پر لکھی ہوئی یہ بے مثل نظم ۶۷ اشعار پر مشتمل ہے اور اس قابل ہے کہ آبِ زر سے لکھی جائے صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لئے تھے

بہار ہے شادیاں مبارک، چمن کو آبادیاں مبارک
ملک فلک اپنی اپنی لے میں یہ گھر عنادل کا بولتے تھے

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
اُدھر سے انوار ہنستے آتے اِدھر سے نفحات اُٹھ رہے تھے

یہ چھوٹ پڑتی تھی اُن کے رُخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے

اُتار کر اُن کے رُخ کا صدقہ یہ نور کا بٹ رہا تھا باڑا
کہ چاند سورج مچل مچل کر جبیں کی خیرات مانگتے تھے

وہی تو اب تک چھلک رہا ہے وہی تو جوبن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لئے تھے

بچا جو تلووں کا ان کے دھوون بنا وہ جنت کا رنگ و روغن
جنھوں نے دولھا کی پائی اُترن وہ پھول گلزارِ نور کے تھے

تجلّیِ حق کا سہرا سر پر، صلوٰۃ و تسلیم کی نچھاور
دو رویہ قدسی پرے جما کر کھڑے سلامی کے واسطے تھے

نماز اقصیٰ میں تھا یہی سر، عیاں ہو معنیِ اوّل آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر جو سلطنت آگے کر گئے تھے

غرض کس کس شعر کو لکھا جائے، طوالت کا خوف دامنگیر ہے ورنہ ہر شعر خود منہ سے بولتا ہے کہ مجھے بھی شامل انتخاب کیا جائے ؎

ہر ایک پھول بجائے خود ایک گلشن ہے
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

اسی قصیدۂ معراجیہ کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب نے سنایا کہ محسن کاکوروی مرحوم نے جب معراج پر اپنا قصیدہ

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

لکھا تو اسے سنانے کے لئے بریلی میں مولانا احمد رضا خاں صاحب کے پاس گئے۔ ظہر کے وقت دو شعر سننے کے بعد طے ہوا کہ محسن کاکوروی صاحب کا پورا قصیدہ عصر کی نماز کے بعد سنا جائے، عصر کی نماز سے قبل مولانا نے خود یہ قصیدۂ معراجیہ تصنیف فرمایا۔ نماز عصر کے بعد جب دونوں بزرگ اکٹھے ہوئے تو مولانا نے محسن مرحوم سے فرمایا کہ پہلے میرا "قصیدۂ معراجیہ" سن لو۔ محسن کاکوروی نے جب مولانا کا قصیدہ سنا تو اپنا قصیدہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور کہا "مولانا! آپ کے قصیدے کے بعد میں اپنا قصیدہ نہیں سنا سکتا"

گذشتہ نصف صدی سے برصغیر پاک وہند کی کوئی ایسی روحانی محفل نہ ہوگی جس میں مولانا کا نعتیہ کلام فردوس گوش نہ بنا ہو۔ مولانا نے نعت گوئی میں ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی۔ جس کی چھاپ آج بیسیوں مشاہیر کے کلام میں نظر آتی ہے۔ مولانا حسن بریلوی، جمیل بریلوی، طالب بریلوی، شفیق جونپوری، حمید صدیقی، بہزاد لکھنوی، اور ضیاء القادری بدایونی وغیرہ نعت گو شعراء کو ہم رضا اسکول کے نمایندہ شاعروں میں شمار کرسکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مولانا کے نعتیہ نغمات سے برصغیر کی فضا گونج اٹھی اور کیوں نہ ہو کہ ع

دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اور ہاں، مولانا سے متاثر ہونے والوں میں سے ایک اہم نام رہ گیا وہ ہے حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی۔ علامہ نے شروع میں جو نعتیں لکھیں اس میں مولانا کی نعتوں کا اثر صاف جھلکتا ہے، نوادرِ اقبال (مرتبہ عبدالغفار شکیل ایم اے) میں ایک دلچسپ واقعہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے مولانا کی زمین میں کچھ اشعار بھی کہے۔

"غالباً ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کا سالانہ جلسہ تھا۔ علامہ اقبال اس جلسہ کے صدر تھے۔ جلسہ میں کسی خوش الحان نعت خوان نے مولانا احمد رضا صاحب کی ایک نظم شروع کردی جس کا ایک مصرع یہ تھا ع

رضائے خدا اور رضائے محمدؐ

نظم کے بعد علامہ اقبال اپنی صدارتی تقریر کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ارتجالاً ذیل کے دو شعر ارشاد فرمائے:۔

تماشہ تو دیکھو کہ دوزخ کی آتش
لگائے خدا اور بجھائے محمدؐ

تعجب تو یہ ہے کہ فردوس اعلیٰ
بنائے خدا اور بسائے محمدؐ

(نوادر اقبال۔ صفحہ ۲۵۔ شائع کردہ۔ سرسید بکڈپو۔ علی گڑھ)

مولانا جس دور میں پیدا ہوئے اس دور کی شاعری بتاتی ہے کہ کوئی شاعر بھی دربار داری، تملق، خوشامد اور قصیدہ گوئی سے بچ نہیں سکا۔ مگر مولانا نے چونکہ حضور تاجدار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و غلامی دل و جان سے قبول کی تھی اس لئے وہ کسی اور کو اپنا آقا، حاکم اور تاجدار نہیں مانتے تھے۔

ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ریاست نانپارہ (ضلع بہرائچ شریف۔ یو۔پی) کی مدح میں شاعروں نے قصائد لکھے کچھ لوگوں نے آپ کی خدمت میں گذارش کی کہ حضرت! آپ بھی نواب صاحب کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھ دیں آپ نے اس کے جواب میں ایک نعت شریف لکھی جس کے چند شعر یہ تھے۔ ؎

وہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

میں نثار تیرے کلام پہ ملی یوں تو کس کو زباں نہیں
وہ سخن ہے جس میں سخن نہ ہو وہ بیاں ہے جس میں بیاں نہیں

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آکے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

وہی لامکاں کے مکیں ہوئے سر عرش تخت نشیں ہوئے

وہ نبی ہیں جس کے ہیں یہ مکاں، وہ خدا ہے جس کا مکاں نہیں

کروں تیرے نام پہ جاں فدا، نہ بس ایک جاں، دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا، کروں کیا، کروڑوں جہاں نہیں
نہیں جس کے رنگ کا دوسرا نہ تو ہو کوئی نہ کبھی نہ ہوا
کہوں اس کو گل، کہے کیا کوئی کہ گلوں کا ڈھیر کہاں نہیں

اور مقطع میں نانپارہ کی بندش کتنے لطیف اشارے میں ادا کرتے ہیں!

کروں مدحِ اہلِ دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

مولانا کی نعتوں میں تکلف یا تصنع نام کو نہیں پایا جاتا بلکہ بے ساختگی اور آمد کی شان نظر آتی ہے۔ اُن کی نعتیں پڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی موج نور رواں دواں ہو۔

مولانا بدرالدین احمد" سوانح امام احمد رضا" میں لکھتے ہیں کہ

"آپ عام اربابِ سخن کی طرح صبح سے شام تک اشعار کی تیاری میں مصروف نہیں رہتے تھے بلکہ جب پیارے مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یاد تڑپاتی اور دردِ عشق آپ کو بے تاب کرتا تو از خود زبان پر نعتیہ اشعار جاری ہو جاتے اور پھر یہی اشعار آپ کی سوزشِ عشق کی تسکین کا سامان بن جاتے چنانچہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب سرورِ دو عالم کی یاد تڑپاتی ہے تو میں نعتیہ اشعار سے بے قرار دل کو تسکین دیتا ہوں ورنہ شعر و سخن میرا مذاق طبع نہیں"۔ (صفحہ ۳۲۸)

مولانا، عربی، فارسی، اردو ہندی کے متبحر عالم تھے۔ ایک بار اُن کے احباب میں سے جناب ارشاد اور جناب ناطق نے (جو خود بھی شاعر تھے)

عرض کیا کہ حضرت! ایک ایسی نعت شریف لکھ دیں جس میں عربی، فارسی، اُردو اور ہندی چاروں زبانیں جمع ہو جائیں۔ آپ نے ان کی فرمائش پر فی البدیہہ نعت شریف لکھ دی۔

لم یات نظیرك فی نظر — مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے — تجھ کو شہِ دوسرا جانا
البحر علا والموج طغیٰ — من بے کس و طوفاں ہوش ربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا — موری نیا پار لگا جانا
یا شمس نظرتِ الیٰ لیلی — چو بطیبہ رسی عرضے بکنی
توری جوت کی جھل جھل جگ میں رچی — مری شب نے نہ دن ہونا جانا
یا قافلتی زیدی اجلك — رحمے بر حسرتِ تشنہ لبک
مورا جیرا لرجے درک درک — طیبہ سے ابھی نہ سنا جانا
واھا لسریعات ذھبت — آں عہد حضور بار گہت
جب یاد آوت موہے کر نہ پرت — دردا وہ مدینہ کا جانا
القلب شج والھم شجون — دل زار چناں جاں زیر چنوں
پت اپنی بپت میں کاسے کہوں — میرا کون ہے تیرے سوا جانا

بس خامۂ خام نوائے رضا نہ یہ طرز مری نہ یہ رنگ مرا
ارشاد احبا ناطق تھا ناچار اس راہ پڑا جانا

اس نعت میں عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی آمیزش نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ یہ امتزاج اتنے متوازن انداز میں کیا گیا ہے کہ نہ اشکال و اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ آہنگ میں کہیں کوئی کمی واقع ہوئی ہے اس سے ان کی تخلیقی صلاحیت اور شاعرانہ جدت طرازی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا کا مشہور و مقبول سلام "مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" ہر شخص نے کئی کئی بار سنا ہوگا اور بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی "ھند و پاک میں شاید ہی کوئی عاشق رسول ایسا ہوگا جس نے اس سلام کے دو چار شعر حفظ نہ کر لئے ہوں۔" بلاشبہ یہ سلام سلاست، روانی، تسلسل، شاعرانہ حسن کاری اور والہانہ پن کی وجہ سے اردو کا سب سے اچھا سلام ہے صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

ہر چرخِ نبوت پہ روشن درود
گلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام

شب اسریٰ کے دولہا پہ دائم درود
نوشۂ بزمِ جنت پہ لاکھوں سلام

صاحبِ رجعتِ شمس وشق القمر
نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام

خلق کے دادرس سب کے فریادرس
کہف روزِ مصیبت پہ لاکھوں سلام

جس کے آگے سرِ سروراں خم رہیں
اُس سرِ تاجِ رفعت پہ لاکھوں سلام

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آگیا
اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

کل جہاں ملک اور جو کی روٹی غذا
اس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام

"حدائق بخشش" میں سب سے پہلی نعت کا عنوان ہے "وصل اول"
..... " زبان وبیان کی ندرت، فصاحت وبلاغت روزمرہ کی صفائی اور اثر آفرینی کے اعتبار سے یہ نعت بڑی بلند پایہ ہے۔ صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

واہ کیا جود وکرم ہے شہِ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

دھارے چلتے ہیں عطا کے وہ ہے قطرہ تیرا
تارے کھلتے ہیں سخا کے وہ ہے ذرّہ تیرا
فیض ہے یا شہِ تسنیم نرالا تیرا
آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا
فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا
آسماں خوان، زمین خوان، زمانہ مہمان
صاحبِ خانہ لقب کس کا ہے تیرا تیرا

اور اس شعر کا جواب توشاید مشکل سے کہیں نظر آئے ؂

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

مولانا نے بعض نعتیں چھوٹی بحروں میں بھی کہی ہیں۔ چھوٹی بحروں میں لکھنا بڑا مشکل سمجھا جاتا ہے لیکن مولانا نے چھوٹی بحروں میں شعر لکھ کر اُن میں جو بڑی بڑی باتیں کہی ہیں وہ اُنہی کا حصہ تھا۔ اُردو کی پوری شاعری میں غالبًا خواجہ میر درد کے علاوہ (اس معاملے میں) اُن کا کوئی مدمقابل نہیں۔ فرماتے ہیں:-

غم ہو گئے بے شمار آقا — بندہ تیرے نثار آقا
بگڑا جاتا ہے کھیل میرا — آقا آقا سنوار آقا
مجبور ہیں ہم تو فکر کیا ہے — تم کو تو ہے اختیار آقا
میں دور ہوں تم تو ہو مرے پاس — سن لو میری پکار آقا

اپنی رحمت کی طرف دیکھیں حضور
جانتے ہیں جیسے ہیں بدکار ہم

جس کو شایاں ہے عرشِ خدا پر جلوس
ہے وہ سلطان والا ہمارا نبیؐ
جن کے تلووں کا دھوون ہے آبِ حیات
ہے وہ جانِ مسیحا ہمارا نبیؐ
جس کی دو بوند ہیں کوثر و سلسبیل
ہے وہ رحمت کا دریا ہمارا نبیؐ

مصطفےٰ خیر الوریٰ ہو
سرورِ ہر دوسرا ہو
اپنے اچھوں کا تصدق
ہم بدوں کو بھی نبا ہو
کوئی کیا جانے کہ کیا ہو
عقلِ عالم سے ورا ہو
سب سے اوّل سب سے آخر
ابتدا ہو انتہا ہو

مولانا نے بعض نعتیہ غزلیں بھی کہی ہیں مثلاً ؎

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
اس گلی کا گدا ہوں میں جس میں
ملتگتے تاجدار پھرتے ہیں
پھول کیا دیکھوں میری آنکھوں میں
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

دل کو ان سے خدا جدا نہ کرے
بے کسی لوٹ لے خدا نہ کرے
یہ دہی ہیں کہ بخش دیتے ہیں
کون ان جرموں پہ سزا نہ کرے

لاج رکھ لی طمعِ عفو کے سودائی کی
اے میں قرباں مرے آقا بڑی آقائی کی

تنگ ٹھہری ہے رضا جس کے لئے وسعتِ عرش
بس جگہ دل میں ہے، اُس جلوۂ ہرجائی کی

یہ ہیں مولانا کے چند اشعار۔ منتخب اشعار نہیں۔ اصل میں اُن کی نعتوں سے شعروں کا انتخاب بڑا ہی مشکل امر ہے۔ حدائقِ بخشش کا ہر شعر منتخب، مصنف کے موقلم کا شاہکار اور اپنی اثر انگیزی اور کیف آفرینی میں مکمل ہے۔ شاید ہی کوئی عاشقِ رسول ہو جو انہیں پڑھ کر از خود رفتہ نہ ہو جائے۔

آخر میں فقط مولانا کے وصال کے وقت پیش آنے والے ایک واقعے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں یہ واقعہ دربار رسالت مآب میں اُن کی نعتوں کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اُن کے وصال کے وقت بیت المقدس میں ایک شامی بزرگ عالم رُؤیا میں دربارِ رسالت مآب میں حاضر ہوئے۔ تمام صحابہ کرام ادر اولیاء اللہ دربار میں حاضر تھے لیکن مجلس پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی آنے والے کا انتظار ہے۔

شامی بزرگ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا!

"میرے ماں باپ حضور پر قربان! کس کا انتظار ہے؟"

سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"احمد رضا کا انتظار ہے۔"

انہوں نے عرض کیا:

"حضورؐ! احمد رضا کون ہیں؟"

ارشاد فرمایا!

"ہندوستان میں بریلی کے باشندے ہیں"۔

بیداری کے بعد وہ شامی درویش مولانا احمد رضا کی زیارت کے شوق میں ہندوستان کی طرف چل پڑے مگر بریلی آکر انہیں معلوم ہوا کہ اس عاشق رسول کا اسی روز (۲۵ صفر سنہ ۱۳۴۰ ہجری کو) وصال ہو گیا تھا جس روز انہوں نے خواب میں حضور سرورِ کائنات کو یہ کہتے سنا تھا کہ

"ہمیں احمد رضا کا انتظار ہے"

حضرت سعدی شیرازی کے بارے میں عارفوں کا کہنا ہے کہ نعت گوئی کے صلے میں انہیں دربار رسالت مآب میں مورچھل جھلنے کا اعزاز حاصل ہے — دربار رسالت میں مولانا کا انتظار کیوں ہو رہا تھا؟ یہ بات تو کوئی عارف ہی بتا سکتا ہے۔ البتہ ہمارا وجدان کہتا ہے کہ انہیں نعت گوئی کے صلے میں دربارِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اعزاز ملنا تھا۔

یا الٰہی جب رضاؔ خوابِ گراں سے سر اٹھائے
دولتِ بیدار عشقِ مصطفےٰ کا ساتھ ہو

عابد نظامی

نذرِ فاضلِ بریلوی

قدس سرہٗ

[محمد سبطین شاہجہانی]

رہے گی قلبِ مسلماں میں تیری یاد سدا!

نظر نظر کو عطا کی ہے تازگی تو نے ‏ ‏ حیاتِ تیرہ کو بخشی ہے روشنی تو نے
ہوا ہے ہمسرِ اوجِ فلک سخن تیرا ‏ ‏ وہ پائی خالقِ اکبر سے برتری تو نے
یہ مہر و ماہ تیری عظمتوں کے قائل ہیں ‏ ‏ زمیں پہ رہ کے بکھیری ہے روشنی تو نے
ضیائیں لے کے عقیدت کے چاند تاروں سے ‏ ‏ فضا میں عام کیا نورِ سرمدی تو نے
زمیں سے تا بہ فلک تیری نعت کے چرچے ‏ ‏ کہاں سے پائی یہ رمزِ نواگری تو نے
اگرچہ نعت کا مجھ کو بھی ذوق شوق ملا ‏ ‏ مگر ادا کیا حقِ سخنوری تو نے
ضیا جو تجھ کو ملی تھی برائے دل زدگان ‏ ‏ وہی حدائقِ بخشش کو بخشدی تو نے

تیری حدائقِ بخشش نے قلب گرمائے
تیرے مزار پہ اللہ نور برسائے

○

مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہٗ
اپنے کلام (نظم و نثر) کے آئینے میں

○

مرتبہ: قاضی عبدالنبی کوکب

اے خدا!

اے خدا اے مہربان مولائے من — اے انیسِ خلوتِ شبہائے من
اے کریمِ کارسازِ بے نیاز! — دائم الاحساں شہِ بندہ نواز
اے بیادت نالۂ مرغِ سحر — اے کہ ذکرت مرہمِ زخمِ جگر

○

اے کہ نامت راحتِ جان و دلم — اے کہ فضلِ تو کفیلِ مشکلم
ہر دو عالم بندۂ اکرامِ تو — صد چو جانِ من فدائے نامِ تو
ما خطا آریم و تو بخشش کنی — نعرۂ "انی غفور" می زنی

○

تو فرستادی بما روشن کتاب — می کنی یا ما باحکامت خطاب
از طفیلِ آں صراطِ مستقیم — قوتِ اسلام را دہ اے کریم
بہرِ اسلامے ہزاراں فتنہ ہا — یک مہ و صد داغ فریاد اے خدا

○

اے خدا بہرِ جنابِ مصطفٰے — چار یارِ پاک و آلِ باصفا
بہرِ جیبِ چاکِ عشقِ نامراد — بہرِ خونِ پاکِ مردانِ جہاد
پُر کن از مقصد تہی دامانِ ما — از تو پذرفتن ز ما کردن دعا

(خدا کی بخشش)

ترجمہ

اے میرے خدا! تو میرا مہربان والی ہے ___، میری راتوں کی تنہائی کا مونس وہمدم۔

شانِ صمدی کے باوجود، تو وہ کارساز کریم ہے، جو ہمیشہ احسان فرماتا ہے، اور تو وہ شہنشاہ ہے، جو اپنے بندوں کو نوازتا ہے۔

مرغ سحر کی آہیں تیری یاد میں ہیں، اور تیرا ہی ذکر زخم جگر کی مرہم ہے۔

تیرا نام، میرے دل وجان کی راحت ___ اور تیرا فضل میری مشکلات کا کفیل!

دونوں جہان، تیرے کرم کے ماتحت ہیں، مجھ جیسی بے شمار جانیں تیرے نام پر نثار!

تو نے ہمیں ایک روشن کتاب (قرآن حکیم) عطا فرمائی۔ اپنے احکام کے آئینے میں تو ہم سے خطاب فرماتا ہے۔

اے مولائے کریم! اس "صراط مستقیم" (قرآن) کے طفیل اسلام کی قوی مدد فرما! اس ایک اسلام کے لئے ہزاروں فتنے ہیں ___ ایک چاند! صدہا داغ اس کا رخ کئے ہیں ___ اے خدا! تیرے حضور میں فریاد ہے!

اے ربِ کریم! جنابِ مصطفٰےؐ کے لئے، ان کے پاک صحابہ کے لئے، آلِ باصفا کیلئے! اس دامن کا صدقہ، جو عشقِ نامراد سے تار تار ہوا ___ اور اس پاک خون کا واسطہ! جو مردوں نے میدان جہاد میں بہایا

ہماری جھولیاں مقصد سے خالی نہ رکھ! ہمارا کام ہے دعا کرنا، تیرا کام ہے قبول کرنا ___"

حضورِ رسالت

رشکِ قمر ہوں، رنگِ رخِ آفتاب ہوں
ذرہ ترا جو اے شہِ گردوں جناب ہوں
بے اصل و بے ثبات ہوں بحرِ کرم مدد!
پروردۂ کنارِ سراب و حباب ہوں

گر آنکھ ہوں تو ابر کی چشمِ پُر آب ہوں
دل ہوں تو برق کا دلِ پُر اضطراب ہوں
حسرت میں خاکِ بوسیٔ طیبہ کی اے رضا
ٹپکا جو چشمِ مہر سے وہ خونِ ناب ہوں

(حدائقِ بخشش)

{ زندگی اور کتاب و قلم }

نہ مرا نوش ز تحسیں نہ مرا نیش ز طعن
نہ مرا گوش بمدحے نہ مرا ہوشِ ذمے
منم و کنجِ خمولے کہ نہ گنجد در وے
جز من و چند کتابے و دوات و قلمے

○

نہ لوگوں کی تحسین کا لطف لیتا ہوں، نہ اُن کی طعن و تشنیع سے جل اٹھتا ہوں۔ میرے کان، مدحت سرائی کے منتظر نہیں رہتے، اور نہ ہی مجھے مذمّت سننے کا ہوش ہے۔ بس میری دُنیا تو میرا وہ گوشۂ گمنامی ہے، جس میں میرے سوا اور میری کتاب و قلم کے سوا، کسی دوسری چیز کی گنجائش ہی نہیں۔

{مسئلہ علم غیب}

"علم ذاتی، اللہ عزّوجلّ سے خاص ہے۔ اس کے غیر کے لئے محال ہے۔ جو اس میں سے کوئی چیز، اگرچہ ایک ذرّہ سے کمتر سے کمتر، غیر خدا کے لئے مانے، وہ یقیناً کافر و مشرک ہے۔"

"اگر تمام اہلِ عالم، اگلے پچھلوں، سب کے جملہ علوم جمع کئے جائیں، تو اِن کو علومِ الٰہیہ سے وہ نسبت نہ ہوگی، جو ایک بوند کے دس لاکھ حصّوں سے ایک حصّے کو، دس لاکھ سمندروں سے۔"

"ہم نہ علم الٰہی سے مساوات مانیں، نہ غیر کے لئے علم بالذات جانیں۔ اور عطائے الٰہی سے بھی بعض علم ہی ملنا مانتے ہیں، نہ کہ جمیع۔"

"اجماع ہے۔ کہ اس فضلِ جلیل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حصّہ، تمام انبیاء، تمام جہان سے اتم و اعظم ہے۔ اللہ عزّ و جلّ کی عطا سے، حبیبِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کو اتنے غیبوں کا علم ہے۔ جن کا شمار اللہ ہی جانتا ہے۔"

(خالص الاعتقاد۔ ص ۲۴، ۲۵، ۳۵)

{سجدہ — صرف خدا کیلئے}

"مسلمان! اے مسلمان! اے شریعتِ مصطفوی کے تابعِ فرمان! جان اور یقین جان اور یقین جان، کہ سجدہ حضرت عزت عز جلالہ کے سوا کسی کے لئے نہیں اس کے غیر کو سجدۂ عبادت تو یقیناً اجماعاً شرکِ مبین وکفرِ مبین۔ اور سجدۂ تحیت حرام وگناہ کبیرہ بالیقین۔ اس کے کفر ہونے میں اختلافِ علمائے دین۔ ایک جماعت فقہاء سے تکفیر منقول ہے ....

.... علماء نے رنگ رنگ کی چہل حدیثیں لکھی ہیں۔ ہم بتوفیقہ تعالیٰ یہاں غیر خدا کو سجدہ حرام ہونے کی چہل حدیث لکھتے ہیں ....

.... صحیح مسلم (میں) ابن جندب، اور معجم طبرانی میں کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے: قال سمعت النبی صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قبل ان یموت بخمس وھو یقول الا ان من کان قبلکم کانو ایتخذون قبور انبیائھم وصالحیھم مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد انی انھاکم عن ذلک۔ میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات پاک سے پانچ روز پہلے حضور کو فرماتے سنا: خبردار! تم سے اگلے اپنے انبیاء اولیاء کی قبروں کو محلِ سجدہ قرار دیتے تھے۔ خبردار! تم ایسا نہ کرنا۔ ضرور! میں تمہیں اس سے منع فرماتا ہوں۔"

(الزبدۃ الزکیۃ۔ ص ۵، ص ۱۰، ص ۲۳)

[اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است]

سیدنا امام ابو یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کتاب الخراج میں فرماتے ہیں:-

أَيُّمَا رَجُلٍ مسلم سَبَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وسَلَّم أَوْ كَذَّبَهُ أَوْ عَابَهُ أَوْ تَنَقَّصَهُ فَقَدْ كَفَرَ بِاللهِ تَعَالىٰ......

"جو شخص مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشنام دے، یا حضور کی طرف جھوٹ کی نسبت کرے، یا حضور کو کسی طرح کا عیب لگائے، یا کسی وجہ سے حضور کی شان گھٹائے، وہ یقیناً کافر اور خدا کا منکر ہو گیا....."

دیکھو کیسی صاف تصریح ہے۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی تنقیصِ شان کرنے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے...... کیا مسلمان اہلِ قبلہ نہیں ہوتا؟ یا اہلِ کلمہ نہیں ہوتا؟ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلیّ اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے ساتھ نہ قبلہ قبول، نہ کلمہ مقبول۔ والعیاذ باللہ ربّ العٰلمین ہ۔"

(حسام الحرمین ص ۲۸)

{ہندوؤں کے ساتھ اتحاد}

تم نے دیکھا، یہ حالت ہے، اِن لیڈر بننے والوں کے دین کی۔ کیسا کیسا شریعت کو بدلتے، مسلتے، پاؤں کے نیچے کچلتے، اور خیر خواہِ اسلام بن کر مسلمانوں کو چھلتے ہیں۔ موالات مشرکین ایک۔ معاہدۂ مشرکین دو۔ استعانت بمشرکین تین۔ مسجد میں اعلائے مشرکین چار۔ ان سب میں بلا مبالغہ، یقیناً، قطعاً لیڈروں نے خنزیر کو دُنبے کی کھال پہنا کر حلال کیا ہے۔ دینِ الٰہی کو دیدہ و دانستہ پامال کیا ہے۔ اور پھر لیڈر ہیں، ریفارمر ہیں، مسلمانوں کے بڑے راہبر ہیں۔ جو ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے، مسلمان ہی نہیں۔ یعنی جب تک اسلام کو کند چھری سے ذبح نہ کرے ایمان ہی نہیں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم

کہ دل آزردہ شوی، ورنہ سخن بسیار است

میں جانتا ہوں۔ کہ میرا کلام انہیں بُرا لگے گا۔ اور حسبِ معمول، تحقیقِ حق و اظہارِ احکامِ ربّ الانام کا نام، گالیاں رکھّا جائے گا......"

(المحجۃ المؤتمنۃ ص ۸۱، ۸۶)

[تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں]

"......دل میں کیا؟ برملا فحش گالیاں دیتے ہیں۔ بعض..... تو مغلظات سے بھرے ہوئے بے رنگ خطوط بھیجتے ہیں۔ پھر ایک نہیں، اللہ اعلم کتنے آتے ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ اُن سے میری ذات پر حملے کریں، تو میں شکر کرتا ہوں، کہ اللہ عزّ وجل نے مجھے دینِ حق کی سپر بنایا۔ کہ جتنی دیر وہ مجھے کوستے، گالیاں دیتے، بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اتنی دیر اللہ، و رسول جلّ جلالہٗ، و صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص سے باز رہتے ہیں۔ اِدھر سے کبھی اس کے جواب کا وہم بھی نہیں۔ اور نہ کچھ بُرا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری عزّت ان کی عزّت پر نثار ہی ہونے کے لئے ہے۔ بلکہ ان پر نثار ہونا ہی عزّت ہے...."

(الملفوظ۔ ج۔ ۲ ص ۵۳)

{سب کو کافر کہہ دیا۔؟}

"...... عوام مسلمین کو بھڑکانے، اور ان دھاڑے اُن پر اندھیری ڈالنے کو یہ چال چلتے ہیں۔ کہ علمائے اہل سُنّت کے فتویٰ تکفیر کا کیا اعتبار۔ یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر کافر کہہ دیتے ہیں۔ ان کی مشین میں، ہمیشہ کفر ہی کے فتوے چھپا کرتے ہیں۔ اسمٰعیل دہلوی کو کافر کہہ دیا۔ مولوی اسحاق صاحب کو کافر کہہ دیا۔ مولوی عبدالحی صاحب کو کہہ دیا۔ پھر جن کی حیا اور بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اتنا اور ملاتے ہیں۔ کہ معاذ اللہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو کہہ دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کو کہہ دیا۔ مولانا شاہ فضل الرحمان (گنج مراد آبادی قدس سرہٗ العزیز) کو کہہ دیا۔ یا پھر جو پورے ہی حدِّ حیا سے اوپر گذر گئے۔ وہ یہاں تک بڑھتے ہیں۔ عیاذاً باللہ عیاذاً باللہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو کہدیا...... یہاں تک۔ کہ ان میں سے بعض کے بزرگواروں نے مولانا مولوی شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی مرحوم و مغفور سے جاکر جڑ دی، کہ معاذ اللہ معاذ اللہ، معاذ اللہ حضرت سیدنا شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ کو کافر کہہ دیا۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ جنّت عالیہ عطا فرمائے۔ انہوں نے آیۂ کریمہ: اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا پر عمل فرمایا۔ خط لکھ کر دریافت کیا۔ جس پر یہاں سے رسالہ: "سبحان البری عن وسواس المفتری" لکھا، ارسال ہوا۔ اور مولانا نے مفتری کذّاب پر لاحول شریف کا تازیانہ بھیجا۔ غرض ہم پر ایسے ہی افترا و بُہتان کرتے ہیں...... "

(حسام الحرمین۔ ص ۴۲)

آرزو دارم کہ میرم در حجاز

ایک مکتوب

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راحتِ جانم، برادرِ دینی، مولوی عرفان علی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

.... ماہ مبارک میں، مطبع والے بھی بہت سست کام کرتے ہیں۔ قاضی عطا علی صاحب کا مضمون، اب شاید بعد رمضان دیکھا جائے .... میرا ارادہ ضرور ہے۔ کہ ؎

یہ سر ہو، اور وہ سنگِ در، وہ سنگ در ہو اور یہ سر
رضا وہ بھی اگر چاہیں، تو اب دل میں یہ ٹھانی ہے

وقتِ مرگ قریب ہے۔ اور میرا دل، ہند تو ہند، مکہ معظمہ میں بھی مرنے کو نہیں چاہتا ہے۔ اپنی خواہش یہی ہے۔ کہ مدینہ طیبہ میں ایمان کے ساتھ موت، اور بقیعِ مبارک میں، خیر کے ساتھ دفن نصیب ہو۔ اور وہ قادر ہے؛ بہر حال اپنا خیال ہے۔ مگر جائداد کی جدائی، یہ لوگ کسی طرح نہ کرنے دیں گے۔ خریدار کو مجھ تک پہنچنے بھی نہ دیں گے۔ کوئی منقول شے نہیں، کہ بازار بھیج کر نیلام کردی جائے۔ اور خالی ہاتھ، بھیک پر گذر کرنے کے لئے جانا، نہ شرعاً جائز، نہ دل کو گوارا۔ دعا کیجئے کہ ہر بات کا انجام بخیر ہو + والسلام

فقیر احمد رضا۔ ۱۰ رماہ مبارک ۱۳۳۲ھ"

("حیات اعلیٰ حضرت" ص ۳۱۶)

مقالات یوم رضا رحمۃ اللہ علیہ